ملکیت زمین اور اُس کی تحدید

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی

مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی

www.KitaboSunnat.com

نام مقالہ ——— ملکیت زمین اور اس کی تحدید
مصنف ——— مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ
باہتمام ——— حافظ محمد یامین (فاضل دارالعلوم کراچی)
کمپوزنگ ——— الفاروق کمپیوٹرز لاہور ۲۲۱۹۵۳
بار دوم ——— رجب ۱۴۱۳ھ

ناشر
مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴
پوسٹ کوڈ ۷۵۱۸۰

ملنے کے پتے
- مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴
- ادارۃ المعارف، دارالعلوم کراچی ۱۴
- دارالاشاعت، ایم۔اے جناح روڈ کراچی
- ادارۂ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

سپریم کورٹ کی شریعت ایلیٹ بنچ میں ہمارے ملک کے مروجہ زرعی اصلاحات کے قوانین کو قرآن وسنت کے منافی ہونے کی بنا پر چیلنج کیا گیا تھا اس مقدمے میں جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے جو تاریخ ساز فیصلہ لکھا، اس میں ملکیت زمین، تحدید ملکیت، اولوالامر کی اطاعت کی حدود اور دوسرے متعلقہ مسائل پر انتہائی پر مغزاور سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں یہ فیصلہ افادہ عام کے لئے کتابی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔ اور کتابی شکل میں اشاعت کے وقت مولانا موصوف نے ضمیمہ کے طور پر دو ابواب کا اضافہ کیا ہے جس میں ملکیت زمین کے خلاف پیش کئے جانے والے دلائل کا تجزیہ اور مزارعت کے جواز اور عدم جواز پر اطمینان بخش بحثیں شامل کر دی گئی ہیں۔ اس طرح اب یہ کتاب "ملکیت زمین اور اس کی تحدید" کے موضوع پر اردو زبان کی مفصل ترین کتاب بن گئی ہے۔ جو انشاء اللہ اہل علم و دانش کے لئے نہایت مفید اور دلچسپ ہوگی اور اس سے اسلام کے معاشی اصولوں...... اور نظام اراضی سے متعلق اس کی تعلیمات کو مستند طریقے سے سمجھنے میں انشاءاللہ مدد ملے گی۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں۔ آمین۔

فاروق القاسمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

إن الحکم إلا للہ علیہ توکلت و علیہ فلیتوکل المتوکلون

عدالت عظمیٰ پاکستان

شریعت اپیلیٹ بینچ

روبروئے:

جناب جسٹس محمد افضل ظلہ صاحب	چیرمین
جناب جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ صاحب	ممبر
جناب جسٹس شفیع الرحمٰن صاحب	ممبر
جناب جسٹس پیر محمد کرم شاہ صاحب	ممبر
جناب جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب	ممبر

شریعت اپیل نمبر ۱ ـــ ۱۹۸۱ء

قزلباش وقف بنام چیف لینڈ کمشنر، پنجاب، لاہور وغیرہ

شریعت اپیل نمبر ۳ ـــ ۱۹۸۱ء

شیر علی خان بنام حکومت پاکستان

شریعت اپیل نمبر ۴ ـــ ۱۹۸۱ء

سید خوشحال خان بنام وفاقی حکومت پاکستان

شریعت اپیل نمبر ۸ ـــ ۱۹۸۱ء

سید علی اکبر محمود بنام ڈپٹی لینڈ کمشنر، رحیم یار خان

شریعت اپیل نمبر ۹ ـــ ۱۹۸۱ء

بشریٰ بی بی بنام ڈپٹی لینڈ کمشنر

شریعت اپیل نمبر ۱۰ ـــ ۱۹۸۱ء

سردار سلطان محمود خان بنام حکومت پاکستان

شریعت اپیل نمبر ایک ـــ در ـــ ۱۹۸۷ء

سید عزیز الاسلام وغیرہ بنام وفاق پاکستان

شریعت اپیل نمبر ۲۱ ـــ در ـــ ۱۹۸۴ء

صوبہ پنجاب بنام عوام الناس پاکستان

تاریخ ہائے سماعت........ ۱۷، ۱۸، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴/ ستمبر ۱۹۸۵ء اور مورخہ ۳/ مئی ۱۹۸۶ء و ۱۶ اق، ۱۸/ جنوری ۱۹۸۸ء

فیصلہ

۱۔ یہ تمام اپیلیں چونکہ فیڈرل شریعت کورٹ کے ایک ہی فیصلے کے خلاف دائر کی گئی ہیں، اور ان سب میں بنیادی مسئلہ ایک، یا ایک جیسا ہے، اس لئے ان تمام اپیلوں کی سماعت بھی ایک ساتھ کی گئی، اور اس فیصلے کے ذریعہ ان سب کا ایک ساتھ تصفیہ مطلوب ہے۔

۲۔ شریعت اپیل نمبر ا ـ 1981ء میں اپیل کنندہ قزلباس وقف ہے، جو ناصر علی خان قزلباس نے ۱۹۵۲ء میں فی سبیل اللہ وقف کیا تھا، یہ وقف ۴۰ مربع زرعی زمین اور دوسری شہر جائیداد پر مشتمل تھا، جس کی آمدنی وقف نامہ کی رو سے مذہبی اور خیراتی مقاصد میں خرچ ہونی تھی۔

۳۔ جب ۱۹۷۲ء میں مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۱۱۵ نافذ ہوا، اور اس کے ذریعہ زمین کی ملکیتوں پر حد عائد کر کے اس حد سے زائد زمینیں مالکان سے لی گئیں تو قزلباش وقف کی متعدد درخواستوں کے باوجود اسے مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۱۱۵ کے احکام سے مستثنٰی قرار نہیں دیا گیا، اور زمین کا جتنا حصہ ۱۴ ہزار یونٹ سے زائد تھا، وہ لے لیا گیا، اور مذکورہ ریگولیشن کے پیراگراف نمبر ۱۸ ذیلی اے شق ۲ کے تحت ۲۵۰ ایکڑ زمین مزارعین کو دے دی گئی۔

۴۔ جنوری ۱۹۷۷ء میں لینڈ ریفارمز ایکٹ ۱۹۷۷ء نافذ ہوا، جس میں ملکیت زمین کی حد اور کم کر کے ۱۰۰ ایکڑ یا ۸ ہزار یونٹ (جو بھی زیادہ ہو) مقرر کر دی گئی، جس کے نتیجے میں وقف کی مزید زمین وقف کے تصرف سے لے لی گئی، اور اب وقف کے پاس ایک ہزار بیس ایکڑ میں سے صرف ۱۰۲ ایکڑ زمین باقی رہ گئی۔

۵۔ قزلباش وقف کی طرف سے اس کارروائی کے خلاف متعدد مقدمات دائر کئے گئے، جو بالآخر ناکام ہوئے، یہاں تک کہ فروری ۱۹۷۹ء میں صدارتی حکم نمبر ۳/۱۹۷۹ء نافذ ہوا، جس کے ذریعہ دستور پاکستان میں ایک نئے باب ۳ ـ اے کا اضافہ کیا گیا، اور ہر ہائی کورٹ میں شریعت بنچیں قائم کی گئیں، جو کسی قانون کو قرآن و سنت کے خلاف قرار دینے کی مجاز تھیں، چنانچہ ۲۱/مارچ ۱۹۷۹ء کو اپیل کنندہ نے لاہور ہائی کورٹ کی شریعت بینچ میں مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ اور لینڈ ریفارمز ایکٹ ۱۹۷۷ء کو قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی بنیاد پر چیلنج کیا، یہ درخواست سماعت کے

لئے منظور ہو گئی، لیکن اس دوران ہائی کورٹوں کی شریعت بینچوں کی جگہ فیڈرل شریعت کورٹ وجود میں آ گیا، چنانچہ یہ درخواست فیڈرل شریعت کورٹ کو منتقل ہو گئی، فیڈرل شریعت کورٹ نے مقدمہ کی سماعت کے بعد اپنے فیصلے مورخہ ۱۳/ دسمبر ۱۹۸۰ء کو اپنے اکثریتی فیصلے کی بنا پر یہ درخواست خارج کر دی، تاہم جسٹس کریم اللہ درانی (مرحوم) نے اپنے اقلیتی فیصلے میں اس درخواست کو منظور کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ مذکورہ قوانین میں "شخص" کی ایسی تعریف جس کی رو سے مسلمان وقف بھی اس میں داخل ہو جائے، قرآن و سنت کے خلاف ہے۔

اب اپیل کنندہ نے فیڈرل شریعت کورٹ کے خلاف اس عدالت میں اپیل دائر کی ہے۔

۶۔ اپیل نمبر ۳ و ۱۰۔ ۱۹۸۱ء میں اپیل کنندہ نے مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۱۱۵ کے پیراگراف نمبر ۸ کو قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی بنا پر چیلنج کیا ہے، جس میں نہری زمین کے ۱۵۰ ایکڑ اور بارانی زمین کے ۳۰۰ ایکڑ یا ۱۲ ہزار پیداواری یونٹ (جو بھی زیادہ ہو) سے زائد زمین ملکیت میں رکھنے پر پابندی عائد کی گئی ہے، اسی طرح لینڈ ریفارمز ایکٹ ۱۹۷۷ء کی اس دفعہ کو چیلنج کیا ہے، جس کی رو سے ملکیت زمین کی حد مزید گھٹا کر ۱۰۰ ایکڑ کر دی گئی ہے۔

۷۔ اپیل نمبر ۴۔ ۱۹۸۱ء میں مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۱۱۵ کے پیراگراف نمبر ۲۴ کو چیلنج کیا گیا ہے، جس میں زمین کی ہر ایسی تقسیم اور ہر ایسے انتقال کو ممنوع قرار دیا گیا، جس کے ذریعہ کسی شخص کی زمین کفایتی مقدار (economic holding) سے کم رہ جائے، نیز اپیل کنندہ نے مذکورہ ریگولیشن کے پیراگراف نمبر ۲۵ کے ذیلی فقرہ نمبر ایک (شق اے سے ڈی تک)، اور ذیلی فقرہ نمبر ۳ (اے سے سی تک) کو بھی قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی بنیاد پر چیلنج کیا ہے، پیراگراف نمبر ۲۵ ذیلی فقرہ نمبر ایک مزارعین کو بے دخلی سے تحفظ فراہم کرتا ہے، اور ذیلی فقرہ نمبر ۳ زمین پر عائد ہونے والے تمام واجبات (بیج کی فراہمی وغیرہ) مالک یا قابض کے ذمہ قرار دیتا ہے، البتہ کھاد کی فراہمی زمیندار اور مزارع کی مشترک ذمہ داری قرار دیتا ہے۔

۸۔ شریعت اپیل نمبر ۸، ۹۔ ۱۹۸۱ء میں لینڈ ریفارمز ایکٹ ۱۹۷۷ء کی دفعات ۳، ۴، ۵، ۶، اور ۷ کو قرآن و سنت کے خلاف ہونے کی بنا پر چیلنج کیا گیا ہے، جو زرعی زمین کی ملکیت کی تحدید اور اس سلسلے میں زمین کے انتقالات پر مختلف قسم کی پابندیوں پر مشتمل ہے۔

شریعت اپیل نمبر ایک در ۱۹۸۷ء کے اپیل کنندگان کچھ وہ لوگ ہیں جو مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کی زد میں آنے کی بنا پر اپنی کچھ جائیداد سے محروم ہوئے، شروع میں انہوں نے متعدد اتھارٹیز کے سامنے اپنی درخواستیں پیش کیں، جو ناکام ہوئیں، بالآخر انہوں نے فیڈرل شریعت کورٹ میں ایم۔

ایل۔ آر ۱۱۵ کو قرآن و سنت سے متصادم ہونے کی بنا پر چیلنج کیا۔ فیڈرل شریعت کورٹ نے اپنے ایک مختصر حکم مورخہ ۱۷/۱۱/۱۹۸۶ء کے ذریعہ ان کی درخواست سرسری طور پر خارج کر دی۔ اور اپنے مختصر حکم میں اخراج کی وجہ صرف یہ بیان کی کہ فیڈرل شریعت کورٹ حافظ محمد امین بنام اسلامی جمہوریہ پاکستان (پی۔ ایل۔ ڈی ۱۹۸۱ء Fsc ۲۳) کے مقدمہ میں یہ قرار دے چکا ہے کہ یہ معاملہ اس کی حدود اختیار سماعت میں نہیں ہے۔

اپیل کنندہ کا موقف یہ ہے کہ یہ عدالت (سپریم کورٹ) حکم صوبہ سرحد بنام سعید کمال شاہ (پی۔ ایل۔ ڈی ۱۹۸۶ء Scp ۳۶۰) کے مقدمہ میں مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کی بعض دفعات کے بارے میں یہ قرار دے چکی ہے کہ وہ فیڈرل شریعت کورٹ کی حدود اختیار میں داخل ہے۔ اور اس بنا پر ایم۔ ایل۔ آر ۱۱۵ کی بعض دفعات کو قرآن و سنت سے متصادم قرار دے چکی ہے۔ ان حالات میں جب کہ اس عدالت کے مذکورہ فیصلے کی بنا پر فیڈرل شریعت کورٹ کا دائرہ اختیار واضح ہو گیا ہے۔ اور یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ایم۔ ایل۔ آر ۱۱۵۔ اس کی حدود اختیار سے خارج نہیں ہے تو اب ان کا یہ مقدمہ فیڈرل شریعت کورٹ کو ریمانڈ کرنا چاہئے۔ تاکہ فیڈرل شریعت کورٹ مقدمہ کے ذاتی حسن و قبح (Merits) کی بنیاد پر اس کا فیصلہ کرے۔

جہاں تک اس مقدمہ کے ریمانڈ کا تعلق ہے۔ اپیل کنندگان کا موقف اس لئے قابل تسلیم نہیں ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ نے حافظ محمد امین بنام اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مقدمہ میں صرف اختیار سماعت کے فقدان کی وجہ سے درخواست خارج نہیں کی تھی۔ بلکہ ساتھ ہی ریمانڈ کے امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے اصولوں (Merits) پر بھی فیصلہ دے دیا تھا۔ اور اب وہ فیصلہ دوسری منسلکہ اپیلوں کے ذریعہ ہمارے پاس چیلنج کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس مقدمہ کو ریمانڈ کرنے کے بجائے ہم میرٹس کی بنیاد پر اس کا تصفیہ دوسری منسلکہ اپیلوں کے ساتھ کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اپیل کنندگان کا مقصد بھی ایم۔ ایل۔ آر ۱۱۵ کی دفعات کو چیلنج کرنا ہے۔ جو مذکورہ حد سے زائد زمینوں کو بلا معاوضہ چھین لینے کے احکام پر مشتمل ہیں۔

شریعت اپیل نمبر ۲۱ در ۱۹۸۴ء صوبائی حکومت پنجاب نے فیڈرل شریعت کورٹ کے اس فیصلے کے خلاف دائر کی ہے جس کے ذریعہ اس نے پنجاب ٹیننسی ایکٹ ۱۸۸۷ء کی دفعہ ۶۰۔ اے میں ترمیم کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اس اپیل میں جو مسئلہ اٹھایا گیا ہے۔ وہ بھی چونکہ ایم۔ ایل۔ آر ۱۱۵ کے بعض احکام سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس اپیل کی سماعت بھی مذکورہ بالا اپیلوں کے ساتھ کی گئی ہے۔

۹۔ یہ مقدمات جس بنیادی مسئلہ سے متعلق ہیں، ان کے تصفیہ کے لئے پہلے مندرجہ ذیل نکات کی تحقیق ضروری ہو گی:

(۱) کیا اسلام میں زمین کی انفرادی ملکیت تسلیم کی گئی ہے؟

(۲) کیا اسلام نے زمین یا دوسری املاک میں ملکیت کی کوئی حد مقرر فرمائی ہے؟

(۳) اگر اسلام نے از خود ملکیت کی کوئی حد مقرر نہیں کی، تو کیا کسی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ملکیت کی کوئی حد مقرر کر دے؟ اور کسی قانون کے ذریعہ عوام کو اس بات کا پابند بنا دے کہ وہ اس مقررہ حد سے زائد کوئی چیز اپنی ملکیت میں نہ لائیں؟

(۴) کیا اسلام میں حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ افراد کی کسی شخصی ملکیت کو ان کی رضامندی کے بغیر ان کی ملکیت سے نکال دے؟ اگر یہ اختیار حاصل ہے تو کن حالات میں؟ اور معاوضے کے ساتھ یا بلا معاوضہ؟

ہم ان چار نکات سے متعلق قرآن و سنت کی روشنی میں اپنی تحقیق کا نتیجہ ذیل میں پیش کرتے ہیں:

ملکیت زمین کا مسئلہ۔

۱۰۔ چونکہ زیر نظر مقدمات میں کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ اسلام میں زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں ہے۔ بلکہ دونوں فریق اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام میں زمین انفرادی ملکیت کے تحت آ سکتی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت نے بھی اپنے فیصلے میں اس بات کو تسلیم کیا ہے۔ اس لئے اس نکتہ کی توضیح و تشریح میں زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ البتہ چونکہ دوسرے زیر تصفیہ نکات اسی نکتہ پر موقوف ہیں، اس لئے نہایت اختصار کے ساتھ اس مسئلے میں قرآن و سنت کے موقف کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۱۔ قرآن کریم جس معاشرے میں نازل ہوا، وہاں اشیائے صرف (Consumer goods) اور وسائل پیداوار (Factors of Production) دونوں پر انفرادی ملکیت کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ اور اسی کے مطابق معاملات جاری تھے۔ قرآن کریم نے انفرادی ملکیت کے اس اصول میں عملاً کوئی تبدیلی پیدا نہیں فرمائی۔ البتہ کئی مقامات پر یہ واضح فرمایا کہ زمین و آسمان کی تمام اشیاء پر حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ وہی ان اشیاء کا خالق اور ان کا حقیقی مالک ہے۔ اور اس مالک حقیقی نے یہ چیزیں انسانوں کو عطا فرمائی ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ دنیاوی احکام و معاملات کے

لحاظ سے ان اشیاء کے مالک قرار پا گئے ہیں، اور ان کو ان مملوکہ اشیاء پر تمام مالکانہ حقوق حاصل ہو گئے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ ملکیت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، اس لئے یہ بالکل بے مہار اور مادر پدر آزاد ملکیت نہیں ہے، بلکہ اپنے حصول کے طریقے اور استعمال کے لحاظ سے بہت سی حدود کی پابند ہے۔ چنانچہ ان دنیوی مالکوں پر واجب ہے کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کریں، اور ان حدود سے تجاوز نہ کریں۔

۱۲۔ قرآن کریم نے ملکیت کی یہ حقیقت متعدد مقامات پر بیان فرمائی ہے، ایک طرف یہ ارشاد فرمایا:

وللہ ما فی السموات وما فی الأرض

اور اللہ ہی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے (۱)

۱۳۔ لیکن دوسری طرف یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کا مالک حقیقی ہونے کے باوجود دنیوی احکام کے لحاظ سے ان اشیاء کی ملکیت انسانوں کو عطا فرما دی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

أولم یروا أنا خلقنا لهم مما عملت أیدینا أنعاما فهم لها مالکون

اور کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے

۱۔

اپنے ہاتھ کی ساختہ چیزوں میں سے مویشی پیدا کئے، یہاں یہ لوگ ان کے مالک ہو گئے۔ (۱)

۱۴۔ اس طرح یہ واضح فرمانے کے باوجود کہ زمین و آسمان کی تمام اشیاء حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں، اللہ تعالیٰ نے دنیوی احکام کے لحاظ سے ان اشیاء پر انفرادی ملکیت تسلیم فرمائی، اور اس حیثیت سے قرآن کریم میں جابجا ان اشیاء کو "انسانوں کا مال" (یعنی ان کی ملکیت) قرار دیا گیا ہے، (۲) اور اسی بنا پر ان انفرادی ملکیتوں میں غیر ممالک کی مداخلت کو منع فرمایا گیا ہے

۱۔ (نساء ۴: ۱۲۶، ۱۳۱، ۱۳۲۔ مزید دیکھئے سورۃ بقرہ ۲: ۱۰۷ و آل عمران ۳: ۱۰۹، وانعام ۶: ۱۲ و یونس ۱۰: ۵۵، ۶۶، ورعد ۱۳: ۱۶ و ابراہیم ۱۴: ۲، والنحل ۱۶: ۵۲، وطہٰ ۲۰: ۶، والحج ۲۲: ۶۴، والنور ۲۴: ۶۴، والروم ۳۰: ۲۶، ولقمان ۳۱: ۲۶، وسبا ۳۴: ۱، والشوریٰ ۴۲: ۴ وغیرہ۔

(۱) یٰسین ۳۶: ۷۱۔

مثلاً ارشاد ہے:

یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل

اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مال آپس میں ناحق طریقے سے مت کھاؤ۔ (۳)

۱۵۔ لیکن جابجا یہ تنبیہ بھی فرمادی گئی کہ چونکہ تمہاری یہ انفرادی ملکیت اللہ تعالیٰ کی عطا ہے. جو ان تمام چیزوں کا حقیقی مالک ہے. اس لئے جہاں اللہ تعالیٰ تمہیں ان املاک کو خرچ کرنے کا حکم دے. وہاں تمہارے لئے ان کا خرچ ضروری ہو گا. نیز اگرچہ کسی دوسرے شخص کو تمہاری انفرادی ملکیت میں مداخلت کرنے کا حق نہیں ہے. لیکن تمہیں از خود اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اس نعمت کا شکر اس طرح ادا کرنا چاہئے کہ اس ملکیت کے ذریعہ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرو. ارشاد ہے:

و آتوهم من مال الله الذی آتاکم

اور ان (غلاموں) کو وہ اللہ کے اس مال میں سے جو اللہ نے تمہیں دے دیا ہے۔ (۱)

نیز ارشاد ہے:

و ابتغ فی ما آتاك الله الدار الآخرة ولا تنس نصیبك من الدنیا و أحسن کما أحسن الله الیك ولا تبغ الفساد فی الأرض

اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے اس کے ذریعہ آخرت کی جستجو کر. اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش نہ کر. اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی

---

(۲) ایسی تمام آیات کو نقل کرنا تو مشکل ہے. البتہ چند حوالے درج ذیل ہیں:
بقرہ ۲: ۲۶۴. ۱۸۸. ۲۶۱. ۲۷۴. ۲۷۹. و آل عمران ۳: ۱۰. ۱۱۶. ۱۸۶. النساء ۴: ۲. ۶. ۱۰. ۳۶. ۳۸. ۹۵. الانفال ۸: ۲۸. ۳۶. ۷۲. والتوبہ ۹: ۲۴. ۳۴. ۴۴. ۸۶. ۸۵. ۱۰۳. ۱۱۱ ویونس ۱۰: ۸۸ وبنی اسرائیل ۱۷: ۶ طالاحزاب ۳۳: ۲۷ والسبا ۳۴: ۳۷ و محمد ۴۷: ۳۶ والنازیات ۵۱: ۱۹. المجادلۃ ۵۸: ۱۷. الحشر ۵۹: ۸. الصف ۶۱: ۱۱ المنافقون ۶۳: ۹ التغابن ۶۴: ۱۵ المعارج ۷۰: ۲۴. اللیل ۹۲: ۱۱ والھمزۃ ۱۰۴: ۳ والمسد ۱۱۱: ۲۔

(۳) سورۃ النساء ۴: ۲۹. سورۃ البقرۃ ۲: ۱۸۸۔

(۱) النور ۲۴: ۳۳۔ (۲) القصص ۲۸: ۸۲۔

(دوسروں کے ساتھ) احسان کر. اور زمین میں فساد کا خواہاں نہ ہو۔ (۲)

(۱۶) انفرادی ملکیت کی یہ حقیقت کہ دنیا کی ہر چیز اصل میں اللہ کی ہے. اور اللہ نے بندوں کو اس کا مالک بنایا ہے. قرآن کریم نے جابجا بیان فرمایا ہے. اور اس حقیقت کے اعتبار سے اشیائے صرف (Consumer goods) اور وسائل پیداوار (Factors of Production) کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا. چنانچہ زمین کے بارے میں بھی بعینہ یہی بات قرآن کریم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمائی ہے:

ان الارض للہ یورثہا من یشاء من عبادہ

بلا شبہ زمین اللہ کی ہے. اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے. اس کا وارث (مالک) بنا دیتا ہے۔ (۱)

(۱۷) جس طرح زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو گزشتہ آیات میں اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دے کر یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں تمہیں مالکانہ حقوق کے ساتھ عطا فرما دی ہیں. بعینہ اسی طرح سورۂ اعراف کی اس آیت میں زمین کے بارے میں بھی یہی بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ وہ اصل میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے. لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے. اس کا مالک بنا دیتا ہے۔

(۱۸) تقریباً یہی بات سورۂ انعام کے آخر میں ان الفاظ کے ساتھ ارشاد فرمائی گئی ہے:

و ھوالذی جعلکم خلائف الأرض و رفع بعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم فی ما آتاکم. ان ربك سریع العقاب و انہ لغفور رحیم

اور اللہ ہی ہے جس نے تمہیں زمین کا نائب بنایا. اور تم میں سے بعض کو دوسرے بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی. تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے. اس کے بارے میں تمہیں آزمائے. بلاشبہ وہ بڑی مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (۲)

---

(۱) الاعراف ۷. ۱۲۸۔

(۲) الانعام ۶. ۱۶۵۔

(۱۹) پھر جس طرح اشیاء صرف اور دوسری املاک کے بارے میں قرآن کریم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ چونکہ ان کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے. اس لئے جس جگہ وہ ان کو خرچ کرنے کا حکم دے. (مثلاً زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں) وہاں ان کو خرچ کرنا واجب ہے. اسی طرح زمین کے بارے میں بھی یہ ارشاد فرمایا کہ اس کی پیداوار کا ایک حصہ (عشر وغیرہ کی صورت میں) اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ضروری ہے. چنانچہ ارشاد ہے:

یا ایہا الذین آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم و مما أخرجنا لکم من الأرض

اے ایمان والو! خرچ کرو اپنی پاک کمائیوں میں سے اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہیں۔ (۱)

نیز ارشاد ہے:

وھو الذی أنشأ جنت معروشات و غیر معروشات و النخل و الزرع مختلفاً أکلہ و الزیتون و الرمان متشابھا و غیر متشابہ. کلوا من ثمرہ إذا أثمر و آتوا حقہ یوم حصادہ ولا تسرفوا. إنہ لا یحب المسرفین.

اور (اللہ تعالیٰ) وہی ہے جس نے باغات پیدا کئے. وہ بھی جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں. اور وہ بھی جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے جاتے. اور کھجور کے درخت اور کھیتی. جن میں کھانے کی چیزیں مختلف طور کی ہوتی ہیں. اور زیتون اور انار جو باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں. اور کبھی مشابہ نہیں ہوتے. ان سب کا پھل کھاؤ جب وہ پھل دیں. اور اس میں جو حق واجب ہے. وہ کاٹنے کے دن دیا کرو. اور اسراف نہ کرو. بلاشبہ وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۲)

(۲۰) ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم نے "ملکیت" کی حقیقت اور اس کے حقوق و فرائض کے سلسلے میں عام اشیاء صرف اور زمین کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا. بلکہ جس قسم کی انفرادی ملکیت عام اشیاء صرف میں انسانوں کے لئے جائز قرار دی ہے. اسی قسم کی ملکیت زمین پر بھی برقرار رکھی ہے. اور جس قسم کے حقوق عام اموال پر عائد کئے ہیں اسی قسم کے

(۱) البقرۃ ۲: ۲۶۷۔

(۲) سورۃ الانعام ۶: ۱۴۱۔

حقوق زمین پر بھی عائد فرمائے ہیں جس طرح عام اشیاء صرف کے بارے میں فرمایا کہ:

ھوالذی خلق لکم ما فی الأرض جمیعاً۔

(اللہ تعالٰی) وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ تمام چیزیں پیدا فرمائیں جو زمین میں ہیں۔ (۱)

اسی طرح زمین کے بارے میں فرمایا کہ:

و الأرض وضعھا للأنام۔

اور زمینوں کو اللہ تعالٰی نے مخلوق کے لئے بنایا ہے۔ (۲)

(۲۱) لہٰذا جس طرح پہلی آیت سے اشیاء صرف میں انفرادی ملکیت کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی طرح دوسری آیت سے زمین کی انفرادی ملکیت کی نفی کا کوئی سوال نہیں۔ حقیقت حال دونوں جگہ یہ ہے کہ اشیاء صرف ہوں یا زمین اور دوسرے وسائل پیداوار۔ وہ سب اللہ تعالٰی نے انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا فرمائے ہیں۔ ان پر اصلی اور حقیقی ملکیت اللہ تعالٰی کی ہے۔ لیکن اللہ تعالٰی نے دنیا کا نظام چلانے کے لئے ان پر بندوں کو انفرادی ملکیت کے حقوق عطا فرمائے ہیں۔ البتہ ساتھ ہی ان پر کچھ فرائض عائد فرما دئیے ہیں۔ کہ وہ اپنی ان املاک سے فائدہ اٹھاتے وقت ان فرائض کو فراموش نہ کریں۔ اور ان کا ایسا غلط استعمال نہ کریں۔ جو اللہ تعالٰی کے احکام کے خلاف ہو۔

(۲۲)۔ قرآن کریم کے بعد سنت کی طرف آئیں تو اس میں زمین کی انفرادی ملکیت کے احکام اور اس کے حقوق و فرائض اور زیادہ تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ ذیل میں چند وہ احادیث ذکر کی جاتی ہیں۔ جن سے زمین کی انفرادی۔ ملکیت واضح طور پر ثابت ہوتی ہے۔

(۱) حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من أعمر أرضاً لیست لأحد فھو أحق

جو شخص کسی ایسی زمین کو آباد کرے جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو۔ تو وہ اس زمین کا زیادہ حقدار ہے۔ (۳)

---

(۱) البقرۃ ۲: ۲۹۔

(۲) الرحمٰن ۵۵/ ۱۰۔

(۳) صحیح البخاری۔ کتاب الحرث والمزارعۃ۔ باب من احیا ارضا۔ حدیث نمبر ۲۳۳۵۔

اس حدیث سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ بنجر اور غیر مملوک زمین کو آباد کرنے سے وہ آباد کار کی ملکیت میں آ جاتی ہے، اور دوسری طرف یہ بھی ثابت ہوا کہ جو زمین کسی کی ملکیت میں ہو، وہ خواہ غیر آباد پڑی ہو، اسے آباد کرنے سے اس پر ملکیت کے حقوق حاصل نہیں ہوتے۔

۲۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ بالا حکم اور بھی متعدد صحابہ کرام سے مروی ہے، مثلاً حضرت سعید بن زیدؓ آپ سے یہ الفاظ روایت فرماتے ہیں:

من أحيا أرضا ميتة فهي له. وليس لعرق ظالم حق

جو شخص مردہ (غیر مملوک، غیر آباد) زمین آباد کرے تو وہ زمین اسی کی ہے، اور دوسرے کی زمین میں ناحق طور پر آباد کاری کرنے والے کو کوئی حق حاصل نہیں۔ (۱)

اور حضرت عروہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں:

أشهد أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قضى أن الأرض أرض الله، والعباد عباد الله، ومن أحيا مواتاً فهو أحق بها، جاءنا بهذا عن النبي صلى الله عليه وسلم الذين جاؤا بالصلوات عنه.

میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ زمین اللہ کی ہے، اور بندے بھی اللہ کے ہیں، اور جو شخص کسی مردہ زمین کو آباد کرے، وہ اس کا زیادہ حقدار ہے، ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ انہیں لوگوں نے پہنچایا ہے جنہوں نے آپ سے نمازوں کا حکم ہم تک پہنچایا ہے۔ (۲)

اور حضرت طاؤسؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

عادي الأرض لله وللرسول، ثم لكم من بعد، فمن أحيا أرضا ميتة فهي له.

---

(۱) تلخیص سنن ابی داؤد للمنذری، ص۲۶۵ ج۴، حدیث نمبر ۲۹۴۹

(۲) تلخیص سنن ابی داؤد للمنذری، ص۲۶۶، ج۴، حدیث نمبر ۲۹۵۲، مطبوعہ مکتبہ الاثریہ، سانگلہ ہل، پاکستان۔

(۱) کتاب الخراج لابی یوسف، ص۶۵، مطبوعہ بیروت۔

جس زمین کا مدت سے کوئی والی وارث نہ ہو، وہ اللہ اور رسول کی ہے، پھر بعد میں تمہاری ہے، چنانچہ جو شخص کسی مردہ زمین کو آباد کرے گا، وہ زمین اسی کی ہو جائے گی۔ (۱)

۲۴۔ ان احادیث سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوا کہ زمین اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، لیکن جب کوئی شخص کسی غیر مملوک، لاوارث اور بنجر زمین کو آباد کر لے تو وہ اس کی ملکیت میں آ جاتی ہے، دوسری طرف ان احادیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آباد کاری سے صرف انہی زمینوں پر آباد کار کو ملکیت حاصل ہوتی ہے، جو پہلے سے کسی کی شخصی ملکیت میں نہ ہوں، لیکن اگر زمین پہلے سے کسی شخص کی ملکیت میں ہے تو خواہ وہ غیر آباد کیوں نہ پڑی ہو، اس پر اس کی اجازت کے بغیر آباد کاری جائز نہیں، اور ایسی آباد کاری سے آباد کار کا کوئی حق پیدا نہیں ہوتا، اس طرح یہ احادیث شخصی ملکیت کے ثبوت پر بھی دلالت کرتی ہیں، اور اس بات پر بھی کہ جو زمین کسی کی شخصی ملکیت میں ہو، دوسروں کے ذمے اس کی ملکیت کا احترام اسی طرح واجب ہے جس طرح اشیاء صرف کی ملکیت کا۔

۲۵۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے بنجر زمینیں متعدد صحابہ کرام کو مالکانہ حقوق کے ساتھ عطا فرمائیں، مفتوحہ اراضی کو مجاہدین کے درمیان تقسیم فرما کر انہیں ان اراضی کا مالک بنایا، اور جب بنو نضیر کے یہودی جلاوطن ہوئے تو ان کی متروکہ اراضی مہاجرین میں تقسیم کی گئیں، عبدالرحمٰن بن کعبؓ فرماتے ہیں:

فأعطى النبي صلى الله عليه وسلم أكثرها للمهاجرين و قسمها بينهم، وقسم منها رجلين من الأنصار، كانا ذوي حاجة، لم يقسم لأحد من الأنصار غيرهما.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کی اکثر زمینیں مہاجرین کو دیدیں، اور انہیں ان کے درمیان تقسیم فرمایا، اور انصار میں سے بھی دو صاحبان کو زمین کا حصہ عطا فرمایا جو ضرورت مند تھے، انصار میں سے ان صاحبان کے سوا کسی کو ان زمینوں میں سے کچھ نہیں دیا۔ (۱)

اسی طرح جب خیبر فتح ہوا تو آپ نے وہاں کی زمینیں مجاہدین میں تقسیم فرمائیں، امام زہریؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) تلخیص سنن ابی داؤد ص ۲۳۵ ج ۴، حدیث نمبر ۲۸۸۴۔

خمس رسول الله صلى الله عليه وسلم خيبر۔ ثم قسم سائرها على من شهدها و من غاب عنها من أهل الحديبية.

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی اراضی کا پانچواں حصہ بیت المال کے لئے نکالا، پھر باقی تمام اراضی کو غزوۂ حدیبیہ کے شرکاء میں تقسیم فرما دیا۔ جو اس وقت وہاں موجود تھے، ان کو بھی دیا، اور جو موجود نہ تھے ان کو بھی۔ (۲)

(۲۶) اس کے علاوہ بہت سے صحابہ کرام کو آپ نے مختلف اراضی بطور عطیہ عنایت فرمائیں۔ مثلاً امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں اس کے آٹھ نو واقعات ذکر فرمائے ہیں، جن میں مروی ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت وائل بن حجرؓ، حضرت بلال بن حارثؓ حضرت ابیض بن حمالؓ اور حضرت زبیر بن عوامؓ وغیرہ کو زمینیں عطا فرمائیں (۳)

(۲۷) اسی طرح زمینوں کی خرید و فروخت کے بارے میں بھی آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تفصیلی احکام عطا فرمائے، اور مالکان اراضی کو بیع، ہبہ، وقف، اجارہ اور دوسرے تمام تصرفات کی اجازت عطا فرمائی، جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ نے زمینوں پر شخصی ملکیت کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ جائز قرار دیا۔

(۲۸) نیز جس طرح اشیاء صرف میں کسی غیر مالک کی ناحق مداخلت کو آپ نے ناجائز قرار دیا، اسی طرح زمین میں بھی اس کے مالک کی اجازت کے بغیر کسی بھی تصرف کو ناجائز قرار دے کر مالک زمین کے حقوق کو تسلیم کیا، مثال کے طور پر مندرجہ ذیل دو حدیثیں یہ بات ثابت کرنے کے لئے کافی ہوں گی:۔

(۲۹) حضرت سعید بن زیدؓ (حضرت عمرؓ کے بہنوئی) عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، ایک خاتون نے ان پر دعوی کر دیا کہ انہوں نے اس خاتون کی زمین کے کچھ حصہ پر ناحق قبضہ کر لیا ہے، مقدمہ مروان بن حکم کی عدالت میں پیش ہوا تو انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ "میں ان کی زمین کا کوئی حصہ کیسے لے سکتا ہوں؟ جبکہ میں نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

---

(۲) تلخیص سنن ابی داؤد، ص ۲۳۹ ج ۴، حدیث نمبر ۲۹۰۰، کتاب الخراج والامارۃ۔ باب حکم ارض خیبر۔

(۳) تلخیص سنن ابی داؤد، باب اقطاع الارضین، ص ۲۵۸، ج ۴، حدیث نمبر ۲۹۳۵ تا ۲۹۴۸۔

اس کے علاوہ زمینوں کے بطور عطیہ دینے کے مزید واقعات کے لئے ملاحظہ ہو، کتاب الاموال لابی عبید، کتاب احکام الارضین، باب الاقطاع، ص ۲۷۲ تا ۲۷۴، حدیث نمبر ۶۷۴ تا ۶۹۹۔

من أخذ شبراً من الأرض بغير حقه طوقه فى سبع أرضين يوم القيامة.

جو شخص ایک بالشت برابر زمین بھی ناحق لے گا، قیامت کے دن اس کے گلے میں وہ زمین سات زمینوں کے ساتھ طوق بنا دی جائے گی (۱)

اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ "میں تو اس حدیث کی بنا پر اپنی زمین میں سے چھ سو ہاتھ کے برابر زمین ان خاتون کے حق میں چھوڑ چکا ہوں" بلکہ بعد میں جتنی زمین پر اس خاتون کا دعویٰ تھا، اس سے بھی حضرت سعید بن زیدؓ اسی کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ (۲)

(۳۰) اسی طرح حضرت رافع بن خدیجؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من زرع فى أرض قوم بغير إذنهم فليس له من الزرع شيئى وله نفقته.

جو شخص دوسروں کی زمین میں ان کی اجازت کے بغیر کھیتی کرے اس کے لئے کھیتی کا کوئی حصہ حلال نہیں، ہاں اس کا کیا ہوا خرچ اس کا حق ہے۔

(۳۱) بہرکیف! یہ چند سرسری مثالیں تھیں، ورنہ اگر زمین کی انفرادی ملکیت پر دلالت کرنے والی تمام احادیث کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے، لیکن مذکورہ چند مثالیں بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ قرآن و سنت نے زمین پر انفرادی ملکیت کو ٹھیک اسی طرح تسلیم فرمایا ہے جس طرح اشیاء صرف پر، جب کسی زمین پر جائز طریقے سے کوئی ملکیت ثابت ہو جائے، تو اسے وہی مالکانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں، جو کسی مالک کو اشیاء صرف پر حاصل ہو سکتے ہیں۔

یہ بات چونکہ ہمارے زیر بحث مقدمات کے دونوں فریقوں کو تسلیم ہے، اس لئے اس نکتے پر مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ (۱)

۲۔ ملکیت کی حد از روئے اسلام

(۳۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا قرآن و سنت نے زمین یا دوسری املاک میں انسان کے لئے ملکیت کی کوئی ایسی حد مقرر فرمائی ہے جس سے زائد ملکیت حاصل کرنا یا باقی رکھنا از روئے شریعت ممنوع ہو؟

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساقات، باب تحریم الظلم و غصب الارض، حدیث نمبر ۱۱۔۴۔

(۲) حلیۃ الاولیاء لابی نعیم، ص ۹۷ ج ۱، ترجمہ سعید بن زیدؓ۔

۱۔ جامع الترمذی، ابواب الاحکام، باب نمبر ۲۹، حدیث نمبر ۱۳۷۸۔

(۳۳) اس سوال کا جواب بھی سادہ اور واضح ہے۔ اور غالباً اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے، اور وہ یہ کہ اسلام نے حصول ملکیت کے طریقوں پر تو حلال و حرام کی پابندیاں عائد کی ہیں، اور جائز طور پر حاصل کی ہوئی املاک پر کچھ مالی ذمہ داریاں (زکوٰۃ و عشر وغیرہ) بھی لگائی ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص صرف جائز طریقوں پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی املاک میں اضافہ کرے اور ان پر عائد ہونے والے شرعی واجبات بھی ادا کرتا رہے تو پھر املاک کی کوئی ایسی آخری مقدار شریعت نے مقرر نہیں فرمائی جس کے بعد املاک میں کوئی جائز اضافہ ممکن نہ ہو۔

۳۴۔ نہ صرف یہ کہ قرآن و سنت میں جائز طریقے سے حاصل کی ہوئی املاک کی کوئی حد بیان نہیں کی گئی، بلکہ اس کے برعکس ایسی آیات موجود ہیں جن سے ایسی شرعی تحدید کی نفی ہوتی ہے۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں ارشاد ہے:

واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب

اور اللہ جس کو چاہتا ہے، بے حساب رزق دیتا ہے۔ (۱)

ایک دوسرے موقع پر اللہ کے نیک بندوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے:

رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ و اقام الصلوۃ و ایتاء الزکوۃ یخافون یوماً تتقلب فیہ القلوب و الأبصار . لیجزیھم اللہ أحسن ما عملوا و یزیدھم من فضلہ ، و اللہ یرزق من یشاء بغیر حساب .

وہ لوگ کہ کوئی تجارت یا بیع ان کو اللہ کی یاد، نماز کی اقامت، اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ جائینگی، تاکہ اللہ ان کو ان کے بہترین اعمال کا بدلہ دے، اور اپنے فضل سے انہیں اور بھی زیادہ دے۔ اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے، بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔ (۲)

۱۔ البقرۃ ۲/۲۱۲۔

۲۔ النور ۲۴/۳۸۔

۲۔ زیر نظر مقدمے کے نقطہ نظر سے تو واقعتاً اس مسئلے کی مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اس فیصلے کو کتابی شکل میں شائع کرتے وقت مناسب معلوم ہوا کہ یہاں ان مختلف شبہات کا جواب بھی دیا جائے جو ملکیت زمین کے بارے میں

۳۵۔ اسی طرح قرآن کریم نے متعدد مقامات پر ارشاد فرمایا ہے کہ جو رزق انسان کو حلال طریقے سے حاصل ہو. اسے شکر ادا کر کے استعمال کرنا چاہئے. اور اسے حرام یا ناجائز سمجھنا درست نہیں. ارشاد ہے:

قل من حرم زينة الله التي أخرج لعباده و الطيبات من الرزق.
آپ کہہ دیجئے کہ کس نے حرام کیا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی. اور رزق کی پاکیزہ (حلال) اشیاء کو۔ (۱)

قل أرأيتم ما أنزل الله لكم من رزق فجعلتم منه حراماً و حلالاً قل آلله أذن لكم أم على الله تفترون.

آپ کہہ دیجئے ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ اللہ نے جو رزق تمہارے لئے اتارا. پھر تم نے اس میں (اپنی طرف سے) حرام اور حلال کی من گھڑت تقسیم کر لی؟ آپ کہہ دیجئے کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دی تھی؟ یا تم اللہ پر بہتان باندھتے ہو؟ (۲)

۳۶۔ جن ذرائع سے انسان حصول دولت کی کوشش کرتے ہوئے دوسروں کا حق مار سکتا تھا. یا ان پر کسب معاش اور حصول دولت کے دروازے بند کر سکتا تھا. ان کو تو حلال اور حرام کے احکام کے ذریعے اسلام نے خود ہی منع کر دیا. لیکن ان احکام کی رعایت رکھتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنی دولت کو بڑھائے تو شریعت کی نظر میں وہ کوئی گناہ یا عیب نہیں ہے. بلکہ اگر نیت بخیر ہو تو موجب اجر بھی ہو سکتا ہے. اگر کوئی شخص جائز اور پاک صاف ذرائع سے حاصل کی ہوئی آمدنی کے ذریعے زیادہ سے زیادہ صنعتیں قائم کرے. زیادہ سے زیادہ زمینوں کو آباد کرے. اور اس جدوجہد میں اپنے اسلامی فرائض کو فراموش نہ کرے تو اس سے مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے. معاشی سرگرمیوں میں تیزی آتی ہے. روزگار کے مواقع بڑھتے ہیں. اور اگر اسلامی احکام کی پوری رعایت

عموماً اٹھائے جاتے ہیں چنانچہ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے جو فیصلہ کا حصہ نہیں تھا۔ بعد میں اضافہ کیا گیا۔ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اس ضمیمے کا مطالعہ یہیں فرمالیں۔

ہو توانہی سرگرمیوں سے گردش دولت کا دائرہ وسیع ہوتا ہے. غربت میں کمی آتی ہے. اور بالآخر اس سے پورے ملک کے لئے معاشی ترقی کی راہیں کھلتی ہیں۔

لہٰذا یہ تصور درست نہیں ہے کہ کسی شخص کا دولت مند ہونا. یا کارخانوں اور زمینوں کا مالک ہونا بذات خود ہر حالت میں کوئی عیب یا گناہ ہے. یہ عیب اور گناہ اس وقت بنتا ہے. جب انسان اس کے ذریعے دوسروں پر رزق کے دروازے بند کرے. جب حق دار کو اس کا حق نہ دے. جب دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈال کر اپنی تجوری بھرنے کی کوشش کرے. جب حصول دولت کی دوڑ میں حلال اور حرام اور جائز اور ناجائز کی فکر چھوڑ بیٹھے. اور جب اپنے مال پر عائد ہونے والے شرعی واجبات اور حقوق کو پامال کرنے لگے۔ لیکن اگر یہ سب باتیں نہیں ہیں. تو دولت کا زیادہ سے زیادہ حصول بذات خود کوئی خرابی نہیں. اسی لئے قرآن کریم نے جہاں انسان کو کسب معاش اور حلال ذرائع سے حصول مال کی اجازت دی. وہاں اس عمل پر کوئی کمیاتی تحدید (quantitat ion linlt) عائد نہیں کی. مثلاً ارشاد ہے:

ھوالذی جعل لکم الأرض ذلولاً فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقه و إلیه النشور.

اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو رام کر دیا. پس اس کے راستوں میں چلو پھرو. اور اللہ کے رزق میں سے کھاؤ. اور اسی کی طرف پھر زندہ ہو کر جانا ہے۔ (۱)

وکلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً

اور جو کچھ اللہ نے تمہیں رزق دیا ہے. اس میں سے کھاؤ. بشرطیکہ وہ حلال طیب ہو۔ (۲)

فکلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً

پس جو کچھ اللہ نے تمہیں رزق دیا ہے، اس میں سے کھاؤ۔ بشرطیکہ وہ حلال وطیب ہو۔ (۱)

۱۔ الملک ۶۷: ۱۵

۲۔ المائدہ ۵: ۸۸

۱۔ النحل ۱۶: ۱۱۴

کلوا من طیبات ما رزقناکم ولا تطغوا فیه فیحل علیکم غضبی.

کھاؤ ان پاکیزہ اشیاء میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں، اور اس میں سرکشی اختیار نہ کرو کہ میرا غضب تم پر نازل ہو۔ (۲)

یا أیہا الذین آمنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم و اشکروا للہ

اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں دی ہیں، اور اللہ کا شکر ادا کرو۔

کلوا مما رزقکم اللہ ولا تتبعوا خطوات الشیطان

کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں دی ہیں، اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ (۴)

کلوا من رزق ربکم واشکروا لہ بلدۃ طیبۃ و رب غفور.

کھاؤ اپنے پروردگار کے رزق سے اور اس کا شکر ادا کرو، پاکیزہ شہر اور مغفرت کرنے والا پروردگار۔ (۵)

۳۷۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی قرآن کریم نے بہت سے مواقع پر بیان فرمائی ہے کہ رزق کی فراخی اور تنگی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہی اپنی حکمت بالغہ سے کسی پر رزق کو کشادہ کر دیتا ہے، اور کسی پر تنگ۔ مثلاً ارشاد ہے:

لہ مقالید السموات و الأرض یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر

اسی کے قبضے میں ہے آسمانوں اور زمین کی کنجیاں، وہ رزق میں کشادگی پیدا کر دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے، اور تنگی پیدا کر دیتا ہے۔ (۱)

اللہ یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ و یقدر لہ

اللہ پھیلا دیتا ہے رزق اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے، اور تنگی پیدا کر دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے۔ (۲)

۲۔ طٰہٰ ۲۰: ۸۱

۳۔ البقرۃ ۲: ۱۷۲

۴۔ الانعام ۶: ۱۴۲

۵۔ النساء ۴: ۱۵

۱۔ الشوریٰ ۴۲: ۱۲ ۲۔ العنکبوت ۲۹: ۶۲

نیز ارشاد ہے:

نحن قسمنا بینهم معیشتهم فی الحیاۃ الدنیا و رفعنا بعضهم فوق بعض درجات لیتخذ بعضهم بعضا سخریا و رحمت ربك خیر مما یجمعون.

ہم نے تقسیم کی ہے ان کے درمیان ان کی معیشت دنیوی زندگی میں، اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے، تاکہ یہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں، اور تمہارے پروردگار کی رحمت ان (مال و اسباب) سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔ (۳)

۳۸۔ ان آیات قرآنی سے یہ بات واضح ہے کہ نہ صرف یہ کہ قرآن کریم نے جائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی ملکیت کی کوئی کمیاتی حد (Quntitative limit) مقرر نہیں فرمائی، بلکہ ایسی تحدید کی نفی فرمائی ہے، البتہ حلال و حرام کے احکام کے ذریعہ کسب معاش کا نظام ہی ایسا بنا دیا ہے کہ اس میں کسی دوسرے کا حق مار کر ملکیت میں اضافہ کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، چنانچہ سود، قمار، احتکار اور اکتناز وغیرہ کو حرام قرار دے کر اور دوسری طرف زکوٰۃ و صدقات اور میراث و وصیت کے احکام جاری فرما کر دولت کے ناجائز طور پر چند ہاتھوں میں سمیٹنے کی راہیں مسدود فرما دی ہیں، جس کی کچھ تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

۳۹۔ لہٰذا دوسرے تنقیح طلب مسئلے کا جواب بھی نفی میں ہے، یعنی قرآن و سنت نے جائز ملکیت کی کوئی کمیاتی حد مقرر نہیں فرمائی، جس کے معنی یہ ہیں کہ حصول دولت اور صرف دولت کے بارے میں شرعی احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنی املاک میں اضافہ کرنا چاہے تو کسی بھی حد پر پہنچنے کے بعد اس کے راستے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے۔

۳۔ حکومت کی طرف سے تحدید ملکیت۔

۴۰۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی حکومت کو یہ اختیار ہے کہ وہ مصالح عامہ کے پیش نظر اپنے باشندوں کے لئے ملکیت کی کوئی حد مقرر کر دے؟ اور اس حد سے زائد کوئی چیز ملکیت میں لانے یا رکھنے کو قانوناً ممنوع قرار دے دے؟

۴۱۔ اس سوال کے جواب کے لئے ہم قرآن و سنت اور فقہ اسلامی سے رہنمائی حاصل کرتے

۳۔ الزخرف ۴۳: ۳۲

ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تحدید ملکیت کی کئی صورتیں ممکن ہیں، اور ان میں سے ہر ایک صورت کا حکم جدا ہے۔

۴۲۔ تحدید ملکیت کی پہلی صورت یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے ملکیت کی ایک مستقل حد مقرر کر دی جائے۔ اور یہ مستقل قانون بنا دیا جائے کہ اس سے زائد کوئی چیز نہ ملکیت میں لائی جا سکتی ہے، نہ رکھی جا سکتی ہے، اس طرح کی مستقل تحدید قرآن کریم کی رو سے ہرگز جائز نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ۔ جیسا کہ تنقیح نمبر ۲ کے جواب میں تفصیل سے ذکر کیا گیا۔ اسلام نے جائز ملکیت پر کوئی حد عائد نہیں کی، لہٰذا شرعی احکام کو ملحوظ رکھتے ہوئے جائز ذرائع سے ملکیت میں اضافہ کرنا جائز اور مباح کام ہے، اور جس چیز کو شریعت نے جائز قرار دیا ہو، اسے مستقل طور پر ممنوع یا حرام قرار دینے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے، قرآن کریم نے متعدد مقامات پر واضح فرمایا ہے کہ جس طرح حرام چیزوں کو حلال کرنا کسی کے لئے جائز نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کسی شخص کو یہ بھی اختیار حاصل نہیں ہے کہ کسی حلال چیز کو حرام قرار دے دے۔ ارشاد ہے:

يا أيها الذين آمنوا لا تحرموا طيبات ما أحل الله لكم ولا تعتدوا إن الله لا يحب المعتدين

اے ایمان والوں! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں، ان کو حرام نہ ٹھہراؤ، اور حد سے تجاوز نہ کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۱)

قل من حرم زينة الله التي أخرج لعباده و الطيبات من الرزق.

آپ کہہ دیجئے کہ کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہے، اور رزق کی پاکیزہ اشیاء کو۔ (۲)

قل أرأيتم ما أنزل الله لكم من رزق فجعلتم منه حراماً و حلالاً قل آلله أذن لكم أم على الله تفترون.

آپ کہہ دیجئے کہ ذرا بتاؤ تو سہی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جو رزق اتارا تھا، پھر تم نے اس میں سے کچھ کو حرام اور کچھ کو حلال بنا ڈالا۔ آپ کہئے کہ اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دی تھی، یا تم اللہ پر بہتان باندھتے ہو؟ (۳)

۱۔ المائدۃ ۵: ۸۷ ۔ ۲۔ الاعراف ۷: ۳۲ ۔ ۳۔ یونس ۱۰: ۵۹

قد خسر الذين قتلوا أولادهم سفهاً بغير علم و حرموا ما رزقهم الله افتراء على الله. قد ضلوا و ما كانوا مهتدين.

واقعی خسارے میں ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی میں نادانی سے قتل کر ڈالا، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جو رزق عطا فرمایا تھا، اس کو حرام کر لیا، اللہ پر بہتان باندھ کر۔ یہ لوگ گمراہ ہوئے۔ اور راہ پر نہیں آئے۔ (۱)

ولا تقولوا لما تصف ألسنتكم الكذب هذا حلال و هذا حرام لتفتروا على الله الكذب إن الذين يفترون على الله الكذب لا يفلحون.

اور جن چیزوں کے بارے میں تمہارا جھوٹا زبانی دعویٰ ہے. ان کے بارے میں یوں نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھو گے، بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ بہتان باندھتے ہیں، وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ (۲)

قل هلم شهداءكم الذين يشهدون أن الله حرم هذا فإن شهدوا فلا تشهد معهم ولا تتبع أهواء الذين كذبوا بآياتنا والذين لا يؤمنون بالآخرة و هم بربهم يعدلون.

آپ کہہ دیجئے لاؤ اپنے وہ گواہ جو یہ گواہی دیں کہ اللہ نے اس چیز کو حرام کیا ہے، پھر اگر وہ گواہی دیں بھی تو اس کا اعتبار نہ کیجئے، اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا، اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اور جو اپنے پروردگار کے برابر دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ (۱)

يا أيها النبي لم تحرم ما أحل الله لك

اے نبی! آپ اس چیز کو حرام کرتے ہیں، جو اللہ نے آپ کے لئے حلال قرار دی ہے۔ (۲)

۴۳۔ ان آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس طرح کسی چیز کو حلال کر لینا کسی کے لئے

جائز نہیں، اسی طرح جس چیز کو قرآن و سنت نے حرام قرار نہ دیا ہو، اسے اپنی طرف سے حرام یا مستقلاً ممنوع قرار دینے کا بھی کسی کو حق نہیں ہے۔ اور ایسی حلال اشیاء کو کسی شرعی دلیل کے بغیر حرام اور مستقل طور پر ممنوع قرار دینا اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنے کے مترادف ہے۔

۴۴۔ لہٰذا جب قرآن و سنت نے جائز طریقے سے حاصل کی ہوئی املاک کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی، تو اپنی طرف سے کوئی حد مقرر کر کے اس سے زائد املاک کے حصول کو مستقل طور پر ناجائز قرار دینا ایک حلال کو حرام کرنا ہے، جس کا کسی کو اختیار نہیں، اور اگر کوئی قانون مستقل طور پر ایسی تحدید عائد کرے تو وہ قرآن و سنت کے احکام سے یقیناً متصادم ہو گا۔

عارضی تحدید ملکیت۔

۴۵۔ تحدید ملکیت کی دوسری صورت یہ ہے کہ کسی مصلحت عامہ کی خاطر عارضی طور پر کچھ عرصے کے لئے ملکیت کی کوئی حد مقرر کر دی جائے۔ اس عارضی تحدید ملکیت میں بھی دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) ایک صورت یہ ہے کہ مالکوں کی موجودہ املاک کو چھیڑے بغیر یہ حکم جاری کیا جائے کہ آئندہ کوئی شخص فلاں چیز ایک مقررہ حد سے زیادہ اپنی ملکیت میں نہیں لا سکے گا۔

(۲) اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی بھی چیز کی ملکیت کی ایک حد اس طرح مقرر کر دی جائے کہ جس شخص کے پاس اس وقت بھی وہ چیز اس مقررہ حد سے زیادہ موجود ہو، اسے وہ زائد مقدار حکومت کے حوالے کرنی ہو گی، اور آئندہ اس حد سے زیادہ وہ چیز ملکیت میں لانا جائز نہیں ہو گا۔

ان دونوں صورتوں پر الگ الگ گفتگو کرنا ضروری ہے۔

۴۶۔ جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے، وہ درحقیقت ملکیت کی تحدید نہیں ہے، بلکہ ملکیت کی کسی خاص شکل کے حد سے زیادہ استعمال پر پابندی ہے، مثلاً مصالح عامہ کے پیش نظر عارضی طور پر یہ قانون بنا دیا جائے کہ جس شخص کے پاس سو ایکڑ یا اس سے زیادہ زمین موجود ہے، وہ اب کوئی نئی زمین نہیں خرید سکتا، یا جس شخص کے پاس رہائش کے لئے ایک مقررہ رقبے کا مکان موجود ہے، وہ اب کوئی نیا مکان نہیں بنا سکتا۔

۴۷۔ اس قسم کی تحدید اگر مصالح عامہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت کی طرف سے عائد کی

جائے۔ اور اسکا مقصد کسی حلال کو حرام کرنا نہیں، بلکہ عارضی طور پر ایک انتظامی حکم جاری کرنا ہو تو قرآن و سنت سے اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا حاصل ایک مباح کام پر عارضی پابندی لگانا ہے۔ اور اسلامی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ مصالح عامہ کے پیش نظر کسی مباح کام پر عارضی طور سے کوئی پابندی عائد کر دے۔ اور ایسی صورت میں عوام پر واجب ہے کہ وہ اس حکم کی تعمیل کریں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یا أیها الذین آمنوا أطیعوا الله و أطیعوا الرسول و أولی الأمر منکم.

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اور اپنے میں سے ذمہ داروں کی اطاعت کرو۔ (۱)

۴۸۔ اس آیت میں أولی الأمر (حکام) کی اطاعت کو اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت سے الگ کر کے مستقل طور پر ذکر کیا گیا ہے، لہٰذا اس اطاعت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان معاملات میں أولی الأمر کی اطاعت کرو جو شرعاً فرض یا واجب ہیں، کیونکہ فرائض و واجبات پر عمل تو درحقیقت أولی الأمر کی نہیں، بلکہ اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ لہٰذا "اولوالامر" کی اطاعت کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ جب وہ مباحات کے سلسلے میں کوئی حکم دیں تو اس کی اطاعت واجب ہے، البتہ یہ اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ ان کا وہ حکم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کسی حکم کے خلاف نہ ہو، چنانچہ اسی آیت میں آگے ارشاد ہے:

فإن تنازعتم فی شیئ فردوه إلی الله و الرسول

پس اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ (۱)

۴۹۔ عام مسلمانوں اور "اولوالامر" کے درمیان نزاع کی عملی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ "اولوالامر" کوئی حکم جاری کریں، اور عام مسلمان اس حکم کو پسند نہ کریں۔ ایسی صورت میں ہدایت یہ دی گئی کہ اس حکم کو قرآن و سنت کے معیار پر جانچ کر دیکھو، اگر اس حکم میں قرآن و سنت کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی گئی ہے تو پھر وہ حکم واجب الاطاعت نہیں، ہاں اگر اس میں قرآن و سنت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی تو پھر وہ امیر کا حکم ہونے کی حیثیت سے واجب التعمیل ہے۔

۱۔ النساء ۴:۵۹۔

۵۰۔ یہی اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں بیان فرمایا ہے. مثلاً":

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما، عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: السمع و الطاعة حق، مالم یؤمر بمعصیة، فإذا أمر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة.

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (امیر کی) بات سننا اور ماننا برحق ہے، جب تک وہ کسی معصیت کا حکم نہ دے، پس اگر وہ کسی معصیت کا حکم دے، تو پھر سننا ماننا نہیں۔ (۲)

نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من یطع الأمیر فقد أطاعنی، و من یعص الأمیر فقد عصانی، و إنما الإمام جنة یقاتل من وراءہ، و یتقی بہ، فإن أمر بتقوی اللہ و عدل، فإن لہ بذالك أجرا، و إن قال بغیرہ، فإن علیہ منہ.

جو شخص امیر کی اطاعت کرے، وہ میری اطاعت کرتا ہے، اور جو امیر کی نافرمانی کرے. وہ میری نافرمانی کرتا ہے، امام تو ایک ڈھال ہے جس کے پیچھے ہو کر جنگ کی جاتی ہے، اور اس سے بچاؤ کیا جاتا ہے، پس اگر وہ خوف خدا کے ساتھ حکم دے اور انصاف کرے تو وہ ثواب کا مستحق ہے، اور اگر اس کے خلاف حکم دے تو اس پر اس حکم کی وجہ سے عذاب ہوگا۔ (۱)

۵۱۔ بہرصورت! قرآن و سنت کے احکام سے یہ بات واضح ہے کہ مباحات کے دائرے میں اسلامی حکومت کوئی ایسا حکم دے جس میں اس نے قرآن و سنت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کی ہو، تو اس کی اطاعت واجب ہے، اور اگر وہ ایسا حکم انصاف کے ساتھ عوام کی مصلحت کے لئے دے تو وہ اس کے لئے باعث اجر ہے۔

۵۲۔ چنانچہ فقہاء اسلام نے بھی یہ اصول بیان کیا ہے کہ مباحات کے دائرے میں امیر کا حکم واجب الاطاعت ہے. فقہ حنفی کی مشہور کتاب "رد المحتار" میں علامہ ابن عابدین شامیؒ نے کئی مقامات پر اس اصول کا تذکرہ کیا ہے کہ:

۲۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب السمع والطاعة للامام، حدیث نمبر ۲۹۵۵

۱۔ صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب نمبر ۱۰۹، حدیث نمبر ۲۹۵۷۔

طاعة الإمام فی ما لیس بمعصیة واجبة

امام (سربراہ حکومت) کی طاعت ان چیزوں میں واجب ہے جو معصیت نہ ہوں۔ (۲)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

إذا أمر الإمام بالصیام فی غیر الأیام المنهیة وجب، لما قدمنا فی باب العیدین من أن طاعة الإمام فیما لیس بمعصیة واجبة.

جن دنوں میں روزہ رکھنا شرعی اعتبار سے ممنوع نہیں ہے، اگر ان میں کسی دن امام روزہ رکھنے کا حکم دے تو اس دن روزہ رکھنا واجب ہے، کیونکہ ہم پہلے باب العیدین میں لکھ چکے ہیں کہ جو بات معصیت نہ ہو، اس میں امام کی اطاعت واجب ہے۔ (۱)

۵۳۔ اسی مسئلہ کو علامہ شامیؒ کے صاحب زادے علامہ علاء الدین ابن عابدینؒ نے علامہ بیریؒ کے حوالے سے زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں:

إن الحاکم لو أمر أهل بلدة بصیام أیام بسبب الغلاء أو الوباء وجب امتثال أمره.

حاکم اگر کسی شہر کے باشندوں کو مہنگائی یا وباء کی وجہ سے کچھ دن روزہ رکھنے کا حکم دے تو اسکے حکم کی تعمیل واجب ہے (۲)

۵۴۔ لیکن اس اصول کے ساتھ ہر جگہ یہ شرط موجود ہے کہ حاکم کا صرف وہ حکم قابل اطاعت ہے جو قرآن و سنت کے خلاف نہ ہو، اور عوام کی مصلحت کے مطابق ہو، لہٰذا حاکم کے حکم کے جائز طور پر واجب الاطاعت ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ضروری ہیں:

(۱) وہ حکم مباحات کے دائرے میں ہو۔

(۲) اس حکم سے قرآن و سنت کے کسی حکم کی خلاف ورزی لازم نہ آتی ہو۔

(۳) اس حکم سے کسی پر ظلم نہ ہوتا ہو۔

(۴) وہ حکم مصلحت کے مطابق ہو۔

---

(۱) رد المحتار، ص ۷۹۲ ج ۱، باب الاستسقاء۔ ۲۔ رد المحتار، ص ۷۸۰ ج ۱، کتاب الصلاۃ، باب العیدین۔

(۲) تکملۃ رد المحتار، ص ۵۴ ج ۲۔

ان شرائط کے ساتھ حاکم کا حکم واجب التعمیل ہے. اور اسی اصول کو فقہاء کرام نے اپنے اس معروف اصول (maxim) کے ذریعہ بیان کیا ہے کہ:

تصرف الامام علی الرعیۃ منوط بالمصلحۃ

امام کی رعیت پر تصرف مصلحت کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ (۱)

۵۵۔ لہٰذا اگر کوئی اسلامی حکومت مصالح عامہ کے پیش نظر یہ حکم جاری کرے کہ آئندہ کوئی باشندہ فلاں چیز مقررہ حد سے زائد اپنے اختیار سے اپنی ملکیت میں نہ لائے تو چونکہ اس حکم سے مذکورہ بالا ۴ شرائط کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی. اس لئے. ایسا حکم جائز اور واجب التعمیل ہے. چنانچہ ایسی تحدید ملکیت جس میں کسی کی ملکیت چھیننی نہ پڑے. بلکہ اس کے طریق استعمال پر پابندی عائد کی گئی ہو. مصالح عامہ کے تحت ہو تو شریعت کے خلاف نہیں ہے۔

مالکوں سے املاک چھین کر تحدید ملکیت

۵۶۔ تحدید ملکیت کی دوسری صورت یہ ہے کہ مالکوں سے ان کی موجودہ املاک چھین کر ان کی ملکیت پر تحدید عائد کی جائے. یعنی یہ قانون بنا دیا جائے کہ جس شخص کے پاس مقررہ حد سے زائد کوئی جائیداد ہوگی. وہ اس سے لے لی جائے گی. پھر اس تحدید کی بھی دو صورتیں ہیں:

(۱) یہ کہ چھینی ہوئی جائیداد کا کوئی معاوضہ مالک کو ادا نہ کیا جائے۔

(۲) یہ کہ جو جائیداد اس سے لی گئی ہے. اس کا معاوضہ ادا کیا جائے۔

یہی دو صورتیں زیر نظر مقدمے سے براہ راست متعلق ہیں. اور ان کے بارے میں یہ دیکھنا ہے کہ قرآن و سنت کی رو سے حکومت کے لئے ایسی تحدید عائد کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۵۷۔ جہاں تک پہلی صورت (بلا معاوضہ جائیدادیں لے لینے) کا تعلق ہے. اگر وہ جائیدادیں ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی ہیں. تو انہیں ضبط کر کے اصل مالکوں یا مستحقین کو دیدینا نہ صرف جائز. بلکہ اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے. لیکن اگر وہ جائیدادیں جائز طریقے سے حاصل کی گئی ہیں تو قرآن و سنت کی رو سے ان پر بلا معاوضہ قبضہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس سوال کا تعلق اسلام کے مجموعی معاشی نظام سے ہے. اور اس سوال کو اسلام کی دوسری معاشی تعلیمات سے الگ کر کے دیکھنا کسی طرح درست نہیں. بلکہ اسی سے غلط فہمیوں کا آغاز ہوتا ہے۔

۵۸۔ جب سے دنیا میں اشتراکی نظام معیشت ایک نئے نظام کی صورت میں سامنے آیا ہے.

(۱) الاشباہ والنظائر. ص۱۵۷ ج۱۔

اس وقت سے بیجا ارتکاز دولت کے خاتمے، منصفانہ تقسیم دولت اور فلاحی معاشی نظام کا تصور نیشنلائزیشن کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ گیا ہے، اور بعض ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ دولت کے صرف چند ہاتھوں میں سمٹنے، اور دوسروں کے اس سے محروم ہونے کا صرف ایک ہی علاج ہے، اور وہ نیشنلائزیشن یا تحدید ملکیت، اس کے علاوہ منصفانہ تقسیم دولت کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی نظام معیشت نیشنلائزیشن یا تحدید ملکیت کا قائل نہ ہو تو وہ لازماً بیجا ارتکاز دولت کا حامی اور منصفانہ تقسیم دولت کا مخالف ہو گا، اور اس سے ضرور سرمایہ دارانہ معیشت کو تقویت ہو گی۔

۵۹۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تصور اسلام کے معاشی احکام اور اس کے بنائے ہوئے منصفانہ نظام معیشت سے ناواقفیت پر مبنی ہے، اسلام بیک وقت بیجا ارتکاز دولت کا پر زور مخالف بھی ہے، اور جائز ملکیت کے احترام کا پر زور داعی بھی، اس نے اپنی معاشی تعلیمات و احکام کے ذریعہ دولت کی آمد و خرچ کا نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ اس کو اپنانے سے دولت صرف چند ہاتھوں میں سمٹ کر کوئی فتنہ نہیں بن سکتی، اسلام کے وہ احکام جو بیجا ارتکاز دولت کے فتنے پر موثر بند باندھتے ہیں، میں انشاء اللہ آگے ذکر کرونگا، لیکن یہاں صرف اس بات کی طرف توجہ دلانی ہے کہ اگر اسلام کسی کی جائز ملکیت کو زبردستی بلا معاوضہ لینے کو منع کرتا ہے تو اس کے معنی ہرگز یہ نہ سمجھنے چاہئیں کہ وہ بیجا ارتکاز دولت کو جواز کا کھلا لائسنس دے رہا ہے، اس لئے کہ اس نے دوسرے راستوں سے اس کا مکمل انسداد کر دیا ہے، جن کی کچھ تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

۶۰۔ اس تمہید کے بعد کسی کی ملکیت کو بلا معاوضہ چھین لینے کے بارے میں قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے احکام ذیل میں پیش کرتا ہوں: (۱)

۶۱۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم ولا تقتلوا أنفسکم إن اللہ کان بکم رحیما. و من یفعل ذالک عدوانا و ظلما فسوف نصلیہ نارا، وکان ذالک علی اللہ یسیرا

---

(۱) واضح رہے کہ یہاں گفتگو کسی کی جائیداد کو چھین لینے کی ہو رہی ہے۔ اس جائیداد پر شرعی یا سرکاری واجبات جو زکوٰۃ یا جائز ٹیکسوں کی شکل میں ہو سکتے ہیں، ان کی اسلام میں کس حد تک اجازت ہے؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ جو اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں۔

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ، لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے واقع ہو تو مضائقہ نہیں، اور تم ایک دوسرے کو قتل نہ کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑے مہربان ہیں۔ (۱)

اس آیت میں یہ اصول واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ کسی بھی شخص کا کوئی مال اس کی مرضی اور معاوضے کے بغیر کسی کے لئے حلال نہیں، آیت میں جو "ناحق طور پر" کہا گیا ہے. اس کی تفسیر میں امام فخر الدین رازیؒ امام المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت حسن بصریؒ سے نقل کرتے ہیں:

"الباطل هو كل ما يوخذ من الانسان بغير عوض"

ناحق ہر وہ مال ہے جو کسی انسان سے بلامعاوضہ (زبردستی) لیا جائے۔ (۲)

۶۲۔ اسی اصول کو ایک دوسری جگہ اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے:

ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل و تدلوا بها إلى الحكام لتأكلوا فريقاً من أموال الناس بالإثم و أنتم تعلمون.

اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ، اور ان کو حکام کے پاس اس غرض سے مت لے جاؤ، کہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ گناہ کے طریقے پر کھاؤ، جب کہ تمہیں علم بھی ہو (کہ ایسا کرنا جائز نہیں) (۱)

۶۳۔ لوگوں کی جائز املاک کے مکمل احترام کی تاکید اور ان پر ان کی رضامندی کے بغیر دست اندازی کی مذمت قرآن کریم نے اور بھی کئی آیتوں میں بیان فرمائی ہے۔ (۲)

۶۴۔ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا ہے:

ولا تبخسوا الناس أشياءهم ولا تعثوا في الأرض مفسدين.

اور لوگوں کے لئے ان کی چیزوں میں کمی نہ کرو، اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔ (۳)

---

(۱) النساء ۴: ۲۹ و ۳۰۔

(۲) التفسیر الکبیر للرازی، ص ۶۹ و ۷۰، ج ۱، مطبوعہ ایران۔

(۱) البقرۃ ۲: ۱۸۸

(۲) ملاحظہ ہو: النساء ۴: ۲ و ۱۰ و ۱۶۱۔ والتوبۃ ۹: ۳۴، الانعام ۶: ۱۵۲، بنی اسرائیل ۱۷: ۳۴۔

(۳) ھود ۱۱: ۸۵ والشعراء ۲۶: ۱۸۳۔

یہ جملہ قرآن کریم میں تین جگہ حضرت شعیب علیہ السلام کی زبانی کہلایا گیا ہے. ان کی قوم ناپ تول میں کمی کرنے کی عادی تھی. اس لئے حضرت شعیب علیہ السلام نے انہیں اس بری عادت کو چھوڑنے کے لئے پہلے تو صاف طور پر فرمایا کہ "ناپ تول میں کمی نہ کرو" اس کے بعد یہ عمومی جملہ ارشاد فرمایا کہ "لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو" مشہور مفسر علامہ ابو حیان اندلسی فرماتے ہیں کہ پہلے تو انہیں ایک خاص جرم سے منع فرمایا گیا جو خرید و فروخت کے وقت ناپ تول میں کمی کی صورت میں کیا جاتا تھا. بعد میں "لا تبخسو االناس اشیاء ہم" فرما کر ہر طرح کے حقوق میں کتر بیونت اور کمی کو عمومی طور پر منع کر دیا۔ (۴)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت صرف ناپ تول میں کمی کے محدود معنی پر ہی دلالت نہیں کرتی. بلکہ لوگوں کی جائز املاک میں ہر ایسا تصرف جو ان میں کمی کا باعث ہو. اس کے عموم میں داخل ہے. لفظ "بخس" کے معنی عربی زبان میں "کمی کرنے" کے آتے ہیں. اور ایک حدیث میں یہ لفظ ٹھیک "تحدید ملکیت" کے معنی میں آیا ہے. اور اس میں حکومت کی طرف سے لوگوں کی جائز املاک میں کمی کرنے کی مذمت کی گئی ہے. اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

یأتی علی الناس زمان یستحل فیه الربا بالبیع ، و الخمر بالنبیذ ، والبخس بالزکاة .

> لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آ جائے گا جس میں سود کو بیع کے بہانے حلال کیا جائے گا. شراب کو نبیذ (شربت خرما یا شربت جو) کے بہانے. اور بخس (لوگوں کا مال کم کر کے قبضہ کرنے) کو زکوٰۃ کے بہانے۔ (۱)

حدیث کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ سود، شراب اور غصب کو اس دلیل سے حلال کیا جائے گا کہ جو مقصد بیع. نبیذ اور زکوٰۃ کا ہے. ہم ان کاموں کے ذریعہ وہی مقصد پورا کر رہے ہیں. لٰہذا یہ حلال کام ہیں. اور "غصب" کے لئے "زکوٰۃ" کا بہانہ استعمال کرنے سے صاف واضح ہے کہ یہاں کسی شخص کے انفرادی غصب کا ذکر نہیں ہو رہا ہے جو حکومت کی طرف سے ہو. کیونکہ زکوٰۃ کا بہانہ وہی استعمال کر سکتی ہے. (۲) اور حکومت بھی زکوٰۃ کا بہانہ اسی وقت اختیار کر سکتی ہے

---

(۴) البحر المحیط -

(۱) الفائق للزمخشری ص۶۵ ج۱. و غریب الحدیث لابن جوزی ص۵۸ ج۱. ولسان العرب لابن منظور ص۲۵ ج۶۔

(۲) چنانچہ مشہور محدث اور فقیہ امام اوزاعیؒ نے اس حدیث کی یہی تشریح فرمائی ہے. کہ اس سے مراد حکام کی طرف سے لوگوں کے اموال پر قبضہ کرنا ہے۔ (دیکھئے. لسان العرب ص۲۵ ج۶)

جب وہ یہ غصب ذاتی عیش و عشرت کے لئے نہ کر رہی ہو، بلکہ بزعم خود "مصالح عامہ" کے نام پر کر رہی ہو، کیونکہ اسی وقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ لوگوں سے یہ مال اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے لیا جا رہا ہے جس مقصد کے لئے زکوٰۃ شریعت نے فرض کی ہے، اس کے باوجود حدیث میں اسے "بخس" قرار دے کر مذکورہ آیت قرآنی کے عموم میں داخل فرمایا گیا ہے، اور حلال قرار دینے کی مذمت فرمائی گئی ہے، جس سے صاف واضح ہے کہ مذکورہ آیت قرآنی حکومت کی طرف سے لوگوں کی جائز املاک کو بلا معاوضہ لینے کی حرمت پر دلالت کر رہی ہے۔

۶۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو عظیم الشان خطبہ دیا، اس میں اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور اسلام کے سیاسی، معاشی اور سماجی اصولوں کا امتیاز نہایت واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا، اس خطبے کا ایک اہم حصہ یہ ہے:

«فان دماءکم و أموالکم و أعراضکم علیکم حرام کحرمة یومکم هذا فی بلدکم هذا فی شهرکم هذا»

پس تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری آبرو تم پر ایسی ہی حرمت کی حامل ہے جیسے اس (مبارک) مہینے، اور اس (مبارک) شہر میں تمہارے اس دن (یعنی یوم حج) کی حرمت ہے۔ (۱)

۶۶۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

کل المسلم علی المسلم حرام، دمه و ماله و عرضه.

ہر مسلمان پورے کا پورا دوسرے مسلمان کے لئے حرام ہے، اس کا خون بھی، اس کا مال بھی، اور اس کی آبرو بھی۔ (۲)

حضرت صخر بن عیلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں:

إن القوم إذا أسلموا أحرزوا أموالهم و دماءهم.

بلاشبہ جب کوئی قوم مسلمان ہو جائے تو وہ اپنے مال اور اپنے خون کو محفوظ کر لیتی

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب لیبلغ العلم الشاهد الغائب۔ حدیث نمبر ۱۰۵، و صحیح مسلم، ج ۲ ص ۶۰، کتاب القسامہ، باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

(۲) صحیح مسلم، ج ۲ ص ۳۱۷، کتاب البر والصلة، باب تحریم ظلم المسلم وخذله واحتقاره ودمه وعرضه وماله۔

ہے۔ (۱)

۶۸۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ عیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من ظلم قيد شبر من الأرض طوقه من سبع أرضين.

جو شخص کسی کی بالشت بھر زمین بھی ناحق لے لے، اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق ڈالا جائے گا۔ (۲)

۶۹۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من ظلم من الأرض شيئا طوق من سبع أرضين.

جو شخص کسی کی بالشت بھر زمین بھی ناحق لے لے، اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق ڈالا جائے گا۔ (۲)

۷۰۔ حضرت عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من أخذ من الأرض شيئا بغير حقه خسف به يوم القيامة إلى سبع أرضين.

جو شخص زمین کا کوئی بھی حصہ حق کے بغیر لے لے، اسے قیامت کے دن سات زمینوں میں دھنسایا جائے گا۔ (۱)

۷۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا يأخذ أحد شبراً من الأرض بغير الحق إلا طوقه الله تعالى إلى سبع ارضين.

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ، باب اقطاع الارضین، حدیث نمبر ۳۰۶۷ و سنن الدارمی ص ۱۴۶ ج ۲، حدیث نمبر ۲۴۸۳۔

(۲) صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب نمبر ۱۳، حدیث نمبر ۲۴۵۳، و کتاب بدء الخلق، حدیث نمبر ۳۱۹۵۔

(۳) صحیح بخاری، کتاب المظالم، حدیث نمبر ۲۴۵۲، و بدء الخلق، حدیث نمبر ۳۱۹۸۔

(۱) صحیح بخاری، کتاب المظالم، حدیث نمبر ۲۴۵۴، و بدء الخلق ۔ حدیث نمبر ۳۱۹۶۔

کوئی بھی شخص بالشت بھر زمین ناحق نہیں لیتا، مگر اللہ تعالیٰ اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق ڈال دیں گے۔ (۲)

۷۲۔ حضرت ابو حمید ساعدی نے رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا یحل لمسلم أن یأخذ مال أخیه بغیر حق ، و ذالك لما حرم الله مال المسلم علی المسلم عصا أخیه بغیر طیب نفس.

کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کا مال کسی حق کے بغیر لے.
اور یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کا مال مسلمان پر حرام کیا ہے. اور اس کو بھی حرام کیا ہے کہ کوئی اپنے بھائی کی لاٹھی بھی اس کی خوش دلی کے بغیر لے۔ (۳)

۷۳۔ حضرت عمر بن یثربی روایت فرماتے ہیں کہ:

سمعت خطبة النبی ﷺ بمنی ، فکان فیما خطب به أن قال : لا یحل لامری من مال أخیه إلا ما طابت به نفسه.

میں نے منیٰ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سنا، اس خطبے میں آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ کسی شخص کے لئے اپنے بھائی کے مال سے کوئی چیز بھی حلال نہیں ہے، سوائے اس کے جو وہ خود خوش دلی سے دیدے۔ (۱)

۷۴۔ حضرت وابلہ بن اسقع روایت فرماتے ہیں کہ:

سمعت رسول الله ﷺ یقول : المسلم علی المسلم حرام دمه، و عرضه، و ماله.

میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا مسلمان مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون بھی، اس کی آبرو بھی، اور اس کا مال بھی۔ (۲)

---

(۲) صحیح مسلم۔ کتاب المساقات۔ باب تحریم الظلم و غصب الارض و غیرھا۔

(۳) (موارد الظمان للہیثمی ص ۲۸۳ و مسند احمد ج ۵ ص ۴۲۵ و کشف الاستار للہیثمی ص ۱۴۴ ج ۲. و رجال الجمیع رجال الصحیح . کمافی مجمع الزوائد ص ۱۷۱ ج ۴)

(۱) مجمع الزوائد. ص ۱۷۱ ج ۴. بحوالہ مسند احمد. ج ۵ ص ۱۱۳. و معجم کبیر طبرانی. ورجال احمد ثقات۔

(۲) رجالہ ثقات. کمافی مجمع الزوائد. ص ۱۷۲ ج ۴. و مسند احمد. ج ۳ ص ۴۹۱۔

۷۵۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

حرمة مال المسلم كحرمة دمه

مسلمان کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت کی طرح ہے۔ (۳)

۷۶۔ ابو حرہ الرقاشی اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه

کسی مسلمان شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں۔ (۱)

۷۷۔ حضرت سائب بن یزید روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

لا يأخذ أحدكم متاع صاحبه لاعباً ولا جاداً، وإذا أخذ أحدكم متاع صاحبه فليردها إليه.

تم سے کوئی شخص اپنے ساتھی کا کوئی سامان نہ مزاق میں لے، نہ سنجیدگی سے، اور اگر کسی کا کوئی سامان کبھی لیا ہو تو اسے اسی کو لوٹا دے۔ (۲)

۷۸۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

قلت: يا رسول الله! أي الظلم أظلم؟ فقال: ذراع من الأرض ينتقصها المرء المسلم من حق أخيه، إلا طوقها يوم القيامة إلى قعر الأرض ولا يعلم قعرها إلا الله الذي خلقها.

میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! سب سے بڑا ظلم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر ایک گز زمین بھی کوئی مسلمان شخص اپنے بھائی کے حق میں سے کم کرے، تو اسے قیامت کے دن زمین کی تہہ تک اس کے گردن میں طوق بنا دیا جائے گا، اور زمین کی تہہ کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ (۱)

---

(۳) مجمع الزوائد۔ ص ۱۷۲ ج ۴، وکشف الاستار للہیثمی۔ ج ۲ ص ۱۳۴۔

(۱) مجمع الزوائد۔ ص ۱۷۲ ج ۴، بحوالہ مسند ابویعلی۔

(۲) مجمع الزوائد۔ ص ۱۷۲ ج ۴، بحوالہ المعجم الکبیر للطبرانی۔

(۱) مجمع الزوائد۔ ص ۱۷۴، ج ۴، ومسند احمد۔ ج ۱ ص ۳۹۷، ومعجم الکبیر للطبرانی، واسناد احمد حسن۔

۷۹۔ حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أعظم الغلول عند الله عز و جل ذراع من الأرض، تجدون الرجلين جارين في الأرض أو في الدار، فيقتطع أحدهما من حظ صاحبه ذراعا إذا اقتطعه طوقه من سبع أرضين إلى يوم القيامة.

اللہ تعالیٰ کے نزدیک عظیم ترین خیانت ایک گز زمین (میں خیانت) ہے، تم اگر دیکھو کہ دو آدمی کسی زمین یا کسی گھر میں پڑوسی ہیں، پھر ان میں سے ایک شخص اپنے ساتھی کے حصے سے ایک گز کاٹ کر لے لیتا ہے تو جب وہ ایسا کرے گا تو قیامت کے دن اس کے گلے میں سات زمینوں کا طوق ڈالا جائے گا۔ (۲)

۸۰۔ حضرت سعد بن ابی وقاص روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من أخذ شيئا من الأرض بغير حقه طوقه من سبع أرضين لا يقبل منه صرف ولا عدل.

جو شخص زمین کا کچھ حصہ کسی جائز وجہ کے بغیر لے لے تو اسے سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا، اور اس سے کوئی معاوضہ یا فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ (۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من غصب رجلا أرضا ظالما لقي الله و هو عليه غضبان.

جو شخص کسی دوسرے شخص سے کوئی زمین ظلماً چھین لے، وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہو گا۔ (۲)

---

(۲) اسنادہ حسن، کمافی مجمع الزوائد، ص۱۷۵ ج۴، ومسند احمد، ج۵ ص۳۴۱

(۱) مجمع الزوائد، ص۱۷۵ ج۴، وکشف الاستار، ج۲ ص۱۳۵۔

(۲) مجمع الزوائد، ص۱۷۶ ج۴، بحوالہ المعجم الکبیر للطبرانی، وفی یحییٰ بن عبدالحمید الحمانی، وھو ضعیف، وقد وثق۔

۸۲۔ حضرت سعید بن زید روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من أحیا أرضا میتة فھی له۔ و لیس لعرق ظالم حق

جو شخص مردہ (غیر مملوک و غیر آباد) زمین کو آباد کرے تو وہ زمین اسی کی ہے، اور دوسرے کی زمین میں ناجائز طور پر آباد کاری کرنے والے کو کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔ (۳)

۸۳۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

إن من قضاء رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم أنه لیس لعرق ظالم حق.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں میں سے ایک فیصلہ یہ ہے کہ کسی ناحق آباد کار کو کوئی حق نہیں۔ (۱)

۸۴۔ حضرت یعلی بن مرہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أیما رجل ظلم شبرا من الأرض کلفه اللہ أن یحفرہ حتی یبلغ آخر سبع أرضین، ثم یطوقه إلی یوم القیامة حتی یقضی بین الناس.

جو شخص بالشت بھر زمین بھی "ظلما" لے تو اللہ تعالیٰ اسے مامور کریں گے کہ وہ اس زمین کو کھودے، یہاں تک کہ سات زمینوں کے آخر تک پہنچ جائے، پھر وہ اس کے گلے کا طوق بنایا جائے گا، یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان مکمل فیصلہ ہو جائے۔ (۲)

۸۵۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو انہیں بہت سی نصیحتیں فرمائیں، ان میں سے ایک نصیحت یہ تھی:

فإن ھم أطاعوا لك بذالك فأخبرھم أن اللہ قد فرض علیھم صدقة تئوخذ

(۳) تلخیص سنن ابی داؤد للمنذری۔ ص۲۶۵ ج۴، حدیث نمبر ۲۹۴۹، و ترمذی، کتاب الاحکام، باب ذکر فی احیاء ارض الموات، حدیث نمبر ۱۳۷۸۔

(۱) مجمع الزوائد، ص۱۷۴ ج۴، مسند احمد، ج۵ ص۳۲۷، والمعجم الکبیر للطبرانی۔

(۲) مجمع الزوائد، ص۱۷۵ ج۴، مسند احمد، ج۴ ص۱۷۳، ورجال بعض اسانیدہ رجال صحیح۔

من أغنياء هم ، فترد على فقراء هم ، فإن أطاعوا لك بذالك فإياك وكرائم أموالهم.

پس اگر وہ لوگ (یعنی یمن کے باشندے) تمہاری اس بات کو مان لیں (کہ پانچ نمازیں ان پر فرض ہیں) تو انہیں بتلایئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے مال میں صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مالدار لوگوں سے لیا جائے گا، اور ان کے حاجت مند افراد میں تقسیم کیا جائے گا. پس اگر وہ اس بارے میں تمہاری اطاعت کر لیں تو ان کی عمدہ اور حرمت والی املاک (میں دست اندازی) سے مکمل پرہیز کرنا۔ (۱)

اس حدیث میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یہ حکم بحیثیت حاکم دیا گیا ہے کہ "ان کی عمدہ اور حرمت والی املاک سے مکمل پرہیز کرنا" اس سے صاف واضح ہے کہ لوگوں کی انفرادی ملکیت کا احترام صرف افراد ہی کی ذمہ داری نہیں. بلکہ حکومت اور اس کے عمال بھی ان تمام احکام کے یکساں طور پر مخاطب ہیں. اور ان کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ لوگوں کی جائز املاک کسی معاوضے کے بغیر ان کی ملکیت سے نکالیں۔

۸۶۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر نظر ڈالی جائے تو اس میں یہ بات واضح طور پر نظر آتی ہے کہ آپ کے عہد مبارک میں مسلمان معاشی اعتبار سے مختلف حیثیتوں کے مالک تھے. بعض حضرات مثلاً حضرت عثمان غنیؓ، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ وغیرہ معاشی طور پر خوشحال صحابہ میں شمار ہوتے تھے، اور بعض حضرات کو نان جویں بھی مشکل سے میسر آتی تھی. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تنگ دست طبقے کو اوپر لانے اور بیجا ارتکاز دولت کو ختم کرنے کے لئے بہت سے اقدامات فرمائے. جن کا اثر بعد میں عام خوشحالی کی صورت میں ظاہر ہوا، لیکن پوری حیات طیبہ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں آپ نے خوشحال صحابہ سے ان کی املاک زبردستی لے کر تنگ دست صحابہ کو دی ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسب معاش کا نظام ایسا بنایا کہ اس میں ہر شخص کو اس کی محنت کا صلہ پورا پورا ملے. ناجائز ذرائع آمدنی پر پابندی عائد فرمائی، محض دولت کے بل بوتے پر دوسروں پر ظلم کرنے کے راستے بند فرمائے، زکوٰۃ، عشر اور میراث کے احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کرایا، لوگوں کو تنگ دست افراد کی مالی امداد کے لئے ترغیب کا راستہ بھی اختیار فرمایا، اور سب سے

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الزکاۃ، وکتاب المغازی، باب نمبر ۶۰، حدیث نمبر ۴۳۴۷۔

بڑھ کر یہ کہ دنیوی مال و متاع کو مقصد زندگی قرار دینے والی ذہنیت کا خاتمہ فرما کر لوگوں میں آخرت کی بہبود کی فکر پیدا فرمائی۔ جس کے نتیجے میں لوگوں نے خوش دلی سے اپنی ضرورت سمجھ کر تنگ دست افراد کی مالی امداد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، لیکن کسی بھی موقع پر لوگوں کو اپنی جائز املاک سے دستبردار ہونے پر سرکاری حکم کے ذریعہ مجبور نہیں فرمایا۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلام معاشی توازن اور منصفانہ تقسیم دولت کے لئے جائز املاک کی کمیاتی تحدید یا لوگوں کی جائز املاک کو زبردستی قبضے میں لینے کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ بلکہ اس سلسلے میں اس کا طریق کار بالکل دوسرا ہے۔ جس کی کچھ تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

۸۷۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سرکاری سطح پر جائز طریقے سے حاصل شدہ ملکیت کے احترام کی ایک واقع مثال غزوۂ حنین کا واقعہ ہے۔ اس جہاد میں مسلمانوں کو کافی مال غنیمت حاصل ہوا تھا۔ جس میں اس زمانے کے دستور کے مطابق غلام اور کنیزیں بھی شامل تھے۔ عام طور سے مال غنیمت کا قاعدہ یہ ہے کہ اس کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل کرنے کے بعد باقی سارا مال مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اور تقسیم کے نتیجے میں جو چیز جس شخص کے حصے میں آ جائے وہ اس کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ بنو ہوازن جن سے حنین کے مقام پر جنگ ہوئی تھی۔ ان کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو توقع تھی کہ شاید وہ شکست کے بعد مسلمان ہو کر آ جائیں گے۔ اس لئے آپ نے مال غنیمت تقسیم کرنے میں اس لئے جلدی نہیں فرمائی کہ اگر وہ لوگ مسلمان ہو کر آ جائیں تو ان کا مال انہی کو واپس کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریباً دو ہفتے ان کا انتظار کیا، اور مال غنیمت تقسیم نہیں کیا، لیکن جب وہ اس پوری مدت میں نہ آئے۔ تو آخر جعرانہ کے مقام پر مال غنیمت (غلاموں اور کنیزوں سمیت) مجاہدین کے درمیان تقسیم فرما دیا۔

اتفاق سے جب مال غنیمت تقسیم ہو چکا تو بنو ہوازن مسلمان اور تائب ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور خواہش ظاہر کی کہ ان کا مال اور غلام کنیزیں واپس کر دی جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تو شروع ہی سے یہ تھی کہ یہ لوگ مسلمان ہو کر آئیں، اور ان کا مال انہیں واپس کر دیا جائے۔ واپس کرنے میں بہت سی دینی اور سیاسی مصلحتیں بھی تھیں، لیکن چونکہ مال تقسیم ہو چکا تھا۔ اس لئے آپ نے بنو ہوازن کے وفد سے فرمایا: کہ میں نے تو دس دن سے زیادہ آپ کے انتظار میں مال غنیمت تقسیم نہیں کیا، لیکن اب جب کہ مال غنیمت تقسیم ہو چکا ہے۔ تو سارے مال کی واپسی تو مشکل ہے۔ البتہ آپ دو چیزوں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں۔ یا

تو مال کا، یا غلاموں اور کنیزوں کا، جس چیز کو آپ پسند کریں، وہ آپ کو واپس کرنے کی کوشش کی جائے گی، انہوں نے غلام اور کنیزوں کی واپسی کو پسند کیا، (جن کی تعداد روایتوں میں چھ ہزار بیان کی جاتی ہے) آپ نے فرمایا جہاں تک میرے اور میرے خاندان کے حصے کا تعلق ہے، وہ تو میں آپ کو واپس دیتا ہوں، لیکن جہاں تک دوسرے مسلمانوں کے حصے کا تعلق ہے، آپ ان سے مل کر بات کر لیں، اور ان پر یہ بات ظاہر کر دیں کہ آپ مسلمان ہو چکے ہیں، میں بھی آپ کی سفارش کروں گا چنانچہ نماز ظہر میں جب تمام مسلمان جمع تھے، بنو ہوازن کے بعض افراد نے کھڑے ہو کر تقریریں کیں، اور مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ اپنے اپنے حصے میں آئے ہوئے غلام اور کنیز واپس کر دیں، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے، اور حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا:

أما بعد، فإن إخواننا جاؤا تائبين، و إني قد رأيت أن أرد إليهم سبيهم، فمن أحب منكم أن يطيب ذلك فليفعل، و من أحب منكم أن يكون على حظه حتى نعطيه إياه من أول ما يفيئ الله علينا فليفعل.

اما بعد، ہمارے بھائی (بنو ہوازن) ہمارے پاس تائب ہو کر آئے ہیں، اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کے جنگی قیدی ان کو لوٹا دوں، اب آپ لوگوں میں سے جو شخص خوش دلی سے اپنے حصے کے غلام یا کنیز (بلا معاوضہ) لوٹانا پسند کرے وہ (بلا معاوضہ) لوٹا دے، اور جو شخص اپنے حصے کو باقی رکھنا چاہے، اس شرط پر اپنے حصے کے غلام کنیز واپس کر دے کہ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو پہلا مال فیئی (بغیر جنگ کے حاصل ہونے والا دشمن کا مال) ہمیں ملے گا، اس میں سے ہم اس کو معاوضہ دیں گے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر لوگوں نے عرض کیا:

قد طيبنا ذلك يا رسول الله!

یا رسول اللہ ہم نے خوش دلی سے غلام اور کنیز واپس کر دیئے۔

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اجتماع منظوری پر بھی اطمینان نہیں ہوا، اور یہ خیال رہا کہ ایسا نہ ہو کہ بعض لوگوں نے مجمع عام میں شرما شرمی منظوری دے دی ہو، یا کچھ لوگ شرم کی وجہ سے خاموش ہو گئے ہوں، اس لئے آپ نے فوراً ہی فرمایا:

إنا لا ندري من أذن منكم في ذلك ممن لم يأذن، فارجعوا حتى يرفع إلينا عرفاؤكم أمركم.

ہمیں ابھی یہ پتہ نہیں چلا کہ آپ میں سے کس نے اجازت دی ہے، اور کس نے نہیں دی، لہٰذا لوگ اپنی اپنی جگہ واپس چلے جائیں، یہاں تک کہ آپ کے نمائندے آپ کی بات ہم تک پہنچائیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، صحیح بخاری میں ہے:

فرجع الناس، فكلمهم عرفاؤهم، ثم رجعوا الى رسول الله ﷺ، فأخبروه أنهم قد طيبوا وأذنوا.

چنانچہ لوگ واپس چلے گئے، اور ان کے قبائلی نمائندوں نے ان سے علیحدگی میں گفتگو کی، پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس واپس آئے، اور بتایا کہ لوگوں نے خوش دلی سے واپسی کی اجازت دے دی ہے۔ (۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور سیرت نگار محمد بن اسحاق نے اب واقعے کی مزید تفصیلات مختلف سندوں سے بیان کی ہے، ان میں بتایا ہے کہ اقرع بن حابس، عیینہ بن حصن، عباس بن مرداس اور بنو تمیم اور بنو فرارہ کے بعض لوگوں نے اپنے حصے بلا معاوضہ لوٹانے سے انکار کیا، اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس پر ادنیٰ سی ناگواری کا بھی اظہار نہیں فرمایا، بلکہ ان سے وعدہ کیا کہ آئندہ پہلے مال فیئ سے انہیں ان کے حصوں کا معاوضہ ادا کر دیا جائے گا۔

(ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام مع الروض الانف ص۳۰۶ ج۲ و فتح الباری ص ۳۴ ج۸)

اس واقعہ کا ایک ایک جزء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے انفرادی ملکیت کے مکمل احترام کا شاہد ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت کے مجموعی مصالح کے پیش نظر یہ چاہتے تھے کہ بنو ہوازن کو ان کے قیدی واپس کر دیئے جائیں، ان قیدیوں کو مسلمانوں کی ملکیت میں آئے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی، ابھی وہ ان کو اپنے گھروں تک بھی نہیں لے جا سکے تھے، یہ غلام اور کنیز ایسی ضروریات زندگی میں بھی شامل نہیں تھے کہ ان کے بغیر مسلمانوں کا گزارہ نہ ہو، یا ان کے بغیر کوئی سخت دشواری پیش آئے، بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کو آزاد کرنے کی بیشمار فضائل بیان فرما کر ہمیشہ صحابہ کرامؓ کو غلام آزاد کرنے کی جابجا ترغیب دی تھی۔——

اگر ایک اسلامی ریاست کے لئے کسی مسلمان کی جائز ملکیت کو زبردستی چھین لینا جائز ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے شاید اس سے زیادہ آسان اور موزوں موقع کوئی اور نہ تھا۔

---

(۱) صحیح بخاری۔ کتاب المغازی، حدیث نمبر ۴۳۱۸ و ۴۳۱۹۔ مع فتح الباری، ص ۳۳ ج ۸۔

لیکن چونکہ قاعدہ کے مطابق یہ غلام اور کنیز مال غنیمت کی تقسیم کے ذریعے مجاہدین کی ملکیت میں آ چکے تھے، اور مالک کی خوش دلی کے بغیر کوئی چیز اس سے زبردستی لینا جائز نہ تھا، اس لئے آپ ؐ نے مسلمانوں سے منظوری لی، اور محض اجتماعی طور پر منظوری لینے کو بھی کافی نہیں سمجھا، کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ یہ اجتماعی منظوری محض ظاہر داری اور ضابطے کی خانہ پری ہو کر نہ رہ جائے، اس لئے عرفاء (قبائلی نمائندوں) کے ذریعہ فرداً فرداً ہر شخص سے اس کی حقیقی منظوری معلوم کی گئی، اور اس کے نتیجے میں جن لوگوں نے معاوضے کا مطالبہ کیا، انہیں کسی ادنیٰ ناگواری کے بغیر معاوضہ دیا گیا۔

اس واقعے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جائز املاک کو بلا معاوضہ لے لینا جس طرح افراد کے لئے جائز نہیں، اسی طرح حکومت کے لئے ناجائز ہے، اور وہ مصالح عامہ کے تحت بھی اس کی مجاز نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی حکومت اس کی مجاز ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اس کا حق دار کوئی نہ تھا۔

۸۸۔ اسی غزوۂ حنین کا ایک اور واقعہ بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہے، جس وقت فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ بنو ہوازن کے سردار مالک بن عوف نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے ایک لشکر جرار اکٹھا کر لیا ہے، اور بعض دوسرے قبائل بھی اس کے ساتھ آ ملے ہیں تو آپ نے مسلمانوں کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا، مسلمانوں کے پاس ہتھیاروں کی کمی تھی، ایسے میں آپ کو اطلاع ملی کہ صفوان بن امیہ کے پاس بہت سے ہتھیار ہیں، صفوان بن امیہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، لیکن ایک غیر مسلم شہری کی حیثیت سے مطیع ہو چکے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے وہ زرہیں اور ہتھیار مانگے، اور فرمایا کہ ہمیں بنو ہوازن کے مقابلے کے لئے ان ہتھیاروں کی ضرورت ہے، صفوان بن امیہ نے پوچھا:

أغصباً یا محمد؟

اے محمد! کیا آپ یہ ہتھیار مجھ سے چھیننا چاہتے ہیں؟

آپ نے جواب دیا:

بل عاریۃ مضمونۃ

نہیں، بلکہ ہم یہ عاریۃً لینا چاہتے ہیں جن کی واپسی کی ضمانت ہو گی۔ (۱)

---

(۱) سنن ابی داؤد۔ وسیرت ابن ہشام، ص ۲۸۸ ج ۲۔

یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح دفاعی ضرورت سے ایک غیر مسلم شہری کا ایک ہتھیار بھی بلا معاوضہ لینا پسند نہیں فرمایا، اور ان کی واپسی کی ضمانت دے کر وہ ہتھیار استعمال فرمائے۔

۸۹۔ مدینہ طیبہ میں وسائل پیداوار کے درمیان عدم توازن کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب مسلمانوں نے جوق در جوق مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ ہجرت شروع کی، اس وقت مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کو نہ صرف ایک دینی فریضہ، بلکہ ایمان کی علامت قرار دیا گیا تھا، اور قرآن کریم کی کئی آیتیں اس سلسلے میں نازل ہو چکی تھیں، مکہ مکرمہ کے یہ باعزت افراد اپنے گھر بار اور زمین و جائیداد چھوڑ کر آرہے تھے، اور انہیں معاشی طور پر بحال کرنا مدینہ طیبہ کی اسلامی ریاست کا ایک بہت بڑا مسئلہ تھا، مدینہ طیبہ کے انصار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے لیلۃ العقبہ میں جو معاہدہ فرمایا تھا، اس میں ایک معاہدہ یہ بھی تھا کہ انصار مدینہ مہاجرین کی ہر ممکن مدد اور غم خواری کریں گے۔ (۱)

لما قدم المهاجرون المدينة من مكة و ليس بأيديهم، وكانت الأنصار أهل الأرض و العقار.

جب مہاجرین مکہ مکرمہ سے مدینہ آئے تو وہ خالی ہاتھ تھے، اور انصار مدینہ زمین جائیداد کے مالک تھے۔ (۲)

اس موقع پر اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار مدینہ سے ان کی زائد از ضرورت زمینیں لے کر مہاجرین میں تقسیم فرماتے تو نہ صرف یہ کہ اس سے مہاجرین کا معاشی مسئلہ پوری طرح حل ہو جاتا، بلکہ یہ انصار مدینہ کے جذبہ ایثار کے عین مطابق ہوتا، لیکن بات صرف اتنی نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسئلے کے حل کا یہ طریقہ سوچا تک نہیں، بلکہ ایک مرحلے پر انصار مدینہ نے خود یہ پیشکش کی کہ آپ ہمارے کھجوروں کے باغات کو ہمارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم فرما دیجئے، لیکن آپ نے اس پیشکش کو بھی قبول نہیں فرمایا، اس کے بعد انصار مدینہ نے متبادل تجویز یہ پیش کی کہ ہمارے مہاجر بھائی ہمارے باغوں میں بٹائی پر کام کریں، اور پھل آدھا آدھا تقسیم کر لیا جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین نے اس تجویز کو قبول فرما لیا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

---

(۱) فتح الباری ص۹ ج۵۔

(۲) صحیح بخاری، کتاب الہبۃ، باب المنیحۃ، حدیث نمبر ۲۶۳۱۔

قالت الأنصار للنبی ﷺ : اقسم بیننا و بین إخواننا النخیل ، قال : لا ۔ فقالوا : تکفونا المؤنة ونشرککم فی الثمرة ۔ قالوا : سمعنا و أطعنا۔

انصار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان نخلستان تقسیم فرما دیجئے، آپ نے فرمایا: نہیں، اس پر انصار نے کہا۔ اچھا آپ لوگ (یعنی مہاجرین) ہمیں باغوں میں کام کرنے سے بے فکر کر دیں، اور ہم آپ کو پھل میں شریک کر لیں گے، مہاجرین نے کہا۔ یہ ہمیں بخوشی منظور ہے۔ (۱)

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اکثر مہاجرین انصار کے باغات میں بٹائی پر کام کرتے رہے۔ اور پھل دونوں کے درمیان تقسیم ہوتا رہا۔ اس کے باوجود بعض مہاجرین ایسے تھے جو بٹائی پر کسی وجہ سے کام نہیں کر سکتے تھے۔ ایسے حضرات کو انصار کی زمینیں تو نہیں دی گئیں، لیکن انصار نے اپنی خوشی سے اپنے باغوں کے بعض درخت ان کے لئے مخصوص کر دیئے۔ کہ ان کا پھل وہ استعمال کر لیا کریں۔ چنانچہ وہ پھل استعمال کرتے رہے۔ لیکن جب غزوۂ خیبر کے بعد مسلمانوں کو وسعت حاصل ہوئی۔ اور مہاجرین کو مال غنیمت سے حصہ ملا تو ایسے تمام حضرات نے وہ درخت بھی انصار کو واپس کر دیئے۔ حضرت انس کی والدہ ام سلیم نے ایک درخت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پیش کیا تھا۔ اور آپ نے اپنے والد کی حبشی کنیز ام ایمن کو (جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کی تھی۔) عطا فرمایا۔ جب دوسرے مہاجرین نے اپنے اپنے درخت واپس کئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وہ درخت اس کی اصل مالک یعنی حضرت ام سلیم کو واپس کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ لیکن حضرت ام ایمن یہ سمجھی تھیں کہ یہ درخت انہیں ہمیشہ کے لئے مالکانہ حقوق کے ساتھ دے دیا گیا ہے۔ اور چونکہ یہ درخت انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا تھا۔ اس لئے وہ اسے ایک تبرک بھی سمجھتی تھیں۔ اور اسے واپس کرنے پر راضی نہ تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے ایک باغ سے دس گنا زائد درخت دے کر راضی کیا۔ حضرت انس فرماتے ہیں:

إن النبی ﷺ لما فرغ من قتال أهل خیبر فانصرف إلی المدینة رد المهاجرون إلی الأنصار منائحهم من ثمارهم ، فرد النبی ﷺ إلی أمه عذاقها ۔ فأعطی رسول الله ﷺ أم أیمن مکانهن من حائطه.

---

۱) صحیح بخاری۔ کتاب المزارعة۔ باب نمبر ۵۔ حدیث نمبر ۲۳۲۵۔ و کتاب الشروط۔ حدیث نمبر ۲۷۱۹۔

> نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اہل خیبر سے جنگ کر کے فارغ ہوئے، اور مدینہ تشریف لائے، تو مہاجرین نے انصار کو ان کے عاریۃً دیئے ہوئے پھل دار درخت واپس کر دیئے۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میری والدہ کو ان کا دیا ہوا درخت بھی واپس کر دیا، اور ام ایمن کو اس کے بدلے اپنے باغ سے عطا فرمایا۔ (۱)

خلاصہ یہ کہ مہاجرین کے معاشی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے بے مثال جذبہ ایثار کے باوجود ان کی زمینوں یا درختوں کو مالکانہ حقوق کے ساتھ لینا یا مہاجرین کے قبضے میں باقی رکھنا گوارا نہیں فرمایا۔

اس تفصیل سے صاف واضح ہے کہ جو حضرات مہاجرین اور انصار کے درمیان "مواخات" کے معاملے کو تحدید ملکیت یا نیشنلائزیشن کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں، وہ کس قدر غلطی پر ہیں، مذکورہ بالا تفصیلات کے بعد یہ واقعہ تو تحدید ملکیت کے حق میں نہیں، بلکہ واضح طور پر اس کے خلاف جاتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سے یہ چند واقعات اس بات کا ناقابل انکار ثبوت ہیں کہ آپ نے انفرادی ملکیت کے احترام کا جو بنیادی اصول بار بار کھلے الفاظ میں بیان فرمایا، وہ محض ایک نظریہ ہی نہیں تھا، بلکہ آپ نے قدم قدم پر اس پر عمل کر کے دکھایا ہے۔ اور انتہائی نازک اور مشکل حالات میں بھی غیر معمولی باریک بینی کے ساتھ اس کی نگہداشت فرمائی ہے، تاکہ آپ کے کسی عمل سے انفرادی ملکیت کو نظر انداز کرنے والے کوئی ادنیٰ سہارا نہ لے سکیں۔

قرآن و سنت کے مذکورہ بالا دلائل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے تعامل کی وجہ سے اس مسئلے پر فقہاء امت کا اجماع اور اتفاق ہے کہ کسی شخص کی جائز ملکیت کو اس سے زبردستی چھیننا کسی کے لئے بھی جائز نہیں، خواہ وہ کوئی فرد ہو یا حکومت، عہد حاضر کے ایک محقق ڈاکٹر سعدی ابو جیب نے "موسوعۃ الاجماع" کے نام سے انسائیکلوپیڈیا مرتب کی ہے، جس میں ان تمام مسائل کو جمع کیا ہے جن پر فقہاء امت کا اجماع اور اتفاق رہا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

أجمع جميع الخاصة و العامة على أن الله عزو جل حرم أخذ مال امرى مسلم

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الہبۃ، باب فضل المنیحۃ، حدیث نمبر ۲۶۳۰، مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو، کتاب المغازی، باب حدیث بنی النضیر، حدیث نمبر ۴۰۳۰، وباب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب، حدیث نمبر ۴۱۲۰، وصحیح مسلم، کتاب الجہاد، ص۹۶ ج۲، حدیث نمبر ۴۳۶۶ و ۴۳۶۷۔

أو معاهد بغير حق . إذا كان المأخوذ منه ماله غير طيب النفس بأن يؤخذ منه ما أخذ و قد أجمعوا جميعا على أن أخذه على السبيل التي وصفنا آثم و ظالم.

تمام خاص وعام کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان یا ذمی کا مال ناحق لینے کو حرام قرار دیا ہے، جب کہ وہ شخص جس سے مال لیا جارہا ہے اس بات پر خوش دلی سے راضی نہ ہو کہ اس سے مال لیا جائے۔ نیز اس بات پر بھی اجماع ہے کہ جو شخص مذکورہ طریقے پر کسی کا مال لے، وہ ظالم اور گناہ گار ہے۔ (۱)

علامہ ابن حزم اندلسی نے بھی اپنی کتاب میں ان مسائل کو جمع کیا ہے جن پر امت کے تمام علماء اور فقہاء کا اتفاق رہا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

«و اتفقوا أن أخذ أموال الناس كلها ظلما لا يحل»

اس بات پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ لوگوں کے کسی بھی قسم کے مال کو ناحق لے لینا حلال نہیں ہے۔ (۱)

علامہ ابن رشد اندلسی فقہاء کرام کے اختلافات کے مستند ترین شارحین میں سے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

لا يحل مال أحد إلا بطيب نفس منه . كما قال عليه الصلاة و السلام و انعقد عليه الإجماع.

کسی شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ (۲)

قاضی محمد بن علی الشوکانی، جو عموماً علمائے اہل حدیث کی ترجمانی کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

ولا شك أن من أكل مال مسلم بغير طيبة نفسه ، أكل له بالباطل و مصرح به في عدة أحاديث . منها حديث «إنما أموالكم و دمائكم عليكم حرام» و

---

(۱) موسوعۃ الاجماع، ص۹۶۸، ج۲ مولفہ سعدی ابوجیب، مطبوعہ دارالفکر، دمشق ۱۴۰۴ھ

(۱) مراتب الاجماع لابن حزم، ص۵۹ مطبوعہ دارالکتاب العربی، بیروت

(۲) بدایۃ المجتہد، ص۱۶۶ ج۲، مطبوعہ مصر، کتاب البیوع، باب ۴، فصل فی النجش۔

قد تقدم و مجمع علیه عند کافة المسلمین۔ و متوافق علی معناہ العقل و الشرع.

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شخص کسی مسلمان کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر کھائے، وہ ناحق کھاتا ہے، اس کی تصریح متعدد احادیث میں موجود ہے، جن میں سے وہ حدیث بھی ہے کہ "تمہارے مال اور تمہارے خون تم پر حرام ہیں"، اور یہ حدیث پیچھے گزر چکی ہے، اور اس مسئلہ پر تمام مسلمانوں کا اجماع بھی ہے، اور عقل و شریعت دونوں اسی کی تائید کرتی ہیں (۱)

۹۱۔ مذکورہ مستند ماخذ میں اس مسئلہ پر اجماع امت نقل کیا گیا ہے، فقہاء امت کا کسی مسئلے پر اجماع و اتفاق بذات خود ایک مستقل دلیل ہے، جس کو قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر میں اور اسلامی احکام کی صحیح فہم حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے، لہٰذا اجماع کی مذکورہ بالا نقول کے بعد فقہاء کرام کے انفرادی اقوال نقل کرنے کی اگرچہ ضرورت نہیں رہتی، تاہم مختلف فقہی مکاتب فکر کے چند اقوال جو ہمارے زیر بحث مسئلے کے بارے میں زیادہ واضح ہیں، ذیل میں نقل کرتا ہوں:

امام ابو یوسف رحمہ اللہ علیہ مشہور امام مجتہد ہیں، اسلامی حکومت کے قاضی القضاۃ بھی رہے ہیں، انہوں نے خلیفہ وقت ہارون رشید کے سوالات کے جواب میں اپنی مشہور کتاب "کتاب الخراج" تصنیف فرمائی ہے، اس کتاب کا بنیادی موضوع اسلام کا نظام محاصل (Public Finance) ہے، لیکن ساتھ ہی انہوں نے اسلامی حکومت کے فرائض اختیارات پر بھی قرآن و سنت کی روشنی میں بڑی سیر حاصل بحثیں کی ہیں، اس میں وہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہیں کہ پچھلی اسلامی حکومتوں نے جو بنجر زمین کسی شخص یا اشخاص کو بطور عطیہ دی ہوں، وہ ان کی ملکیت میں آ جاتی ہیں، اس مسئلے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے دلائل پیش کرنے کے بعد وہ تحریر فرماتے ہیں:

«وکل من أقطعه الولاة المهدیون أرضا من أرض السواد و أرض العرب و الجبال من الأصناف التي ذكرنا أن للإمام أن يقطع منها. فلا يحل لما يأتي بعدهم من الخلفاء أن يرد ذالك. ولا يخرجه من يدي من هو في يده وارثا

(۱) نیل الاوطار للشوکانی، ص ۲۶۸ ج ۵۔ مطبوعہ مصطفیٰ البابی، مصر ۱۳۴۷ھ۔

أو مشتريا. فأما إن أخذ الوالى من يد واحد أرضا وأقطعها آخر. فهذا بمنزلة الغاصب غصب واحداً وأعطى آخر فلا يحل للإمام ولا يسعه أن يقطع أحدا من الناس حق مسلم ولا معاهد. ولا يخرج من يده من ذالك شيئا إلا بحق يجب له عليه. فيأخذه بذالك الذى وجب له عليه. فيقطعه من أحب من الناس بذالك جائزله. والأرض عندى بمنزلة المال. فللإمام أن يجيز من بيت المال من كان له غناء فى الإسلام و من يقوى به على العدو. و يعمل فى ذالك بالذى يرى أنه خير للمسلمين و أصلح لأمرهم. وكذالك الأرضون يقطع الإمام منها من أحب من الأصناف التى سميت و لا أرى أن يترك أرضا لا ملك لأحدفيها، ولا عمارة حتى يقطعها الإمام. فإن ذالك أعمر للبلاد و أكثر للخراج»

اور زمین کی جن قسموں کے بارے میں میں نے پیچھے ذکر کیا ہے کہ امام (اسلامی حکومت) وہ زمینیں کسی کو بطور عطیہ دے سکتا ہے، ان میں سے جو زمینیں پچھلے ہدایت یافتہ سربراہان حکومت نے جن لوگوں کو دی ہیں، خواہ وہ سواد (عراق) کی زمینیں ہوں، یا عرب کی، یا پہاڑوں کی، بعد کے آنے والے خلفاء کے لئے حلال نہیں کہ وہ ان زمینوں کو ان سے واپس لیں، اور نہ یہ جائز ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اب وہ زمینیں ہیں، خواہ انہیں بطور وراثت ملی ہوں، یا انہوں نے اصل مالکوں سے خرید کر حاصل کی ہوں، ان کے قبضے سے انہیں نکالا جائے، رہی یہ بات کہ سربراہان حکومت ایک شخص سے زمین لے کر دوسرے کو دیدے تو یہ بالکل غصب کے حکم میں ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک کا مال غصب کر کے دوسرے کو دیدیا، امام (حکومت) کے لئے حلال نہیں ہے، اور اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان یا اسلامی ریاست کے کسی غیر مسلم شہری کا حق چھین کر کسی اور کو دیدے، اور نہ اس کے لئے جائز ہے کہ اس زمین کو اس کے قبضے سے نکالے، ہاں اگر حکومت کا کوئی حق کسی کے ذمہ واجب ہے، اور وہ اس واجب حق کی بنا پر کوئی زمین اس سے لے لے، اور پھر وہ زمین کسی

اور شخص کو اپنی صوابدید سے دے دے تو یہ اس کے لئے جائز ہے. اور زمین میرے نزدیک عام اموال کی طرح ہے. امام کو یہ حق حاصل ہے کہ جس کسی شخص سے اسلام کو فائدہ پہنچتا ہو. یا جس سے دشمن کے خلاف قوت حاصل ہوتی ہو. اس کو بیت المال سے کوئی عطیہ دے دے. اور ہر وہ اقدام کرے جس میں مسلمانوں کی بھلائی. اور ان کے معاملات کی مصلحت ہو. یہی حال زمین کا ہے. زمین کی جن قسموں کا میں نے شروع میں ذکر کیا ہے. امام وہ زمینیں مصلحت کے مطابق جسے چاہے دے سکتا ہے. اور میری رائے یہ ہے کہ امام کو کوئی زمین یا عمارت ایسی نہ چھوڑنی چاہئے جس پر کسی شخص کی ملکیت نہ ہو. بلکہ ایسی زمین لوگوں میں تقسیم کر دینی چاہئے. کیونکہ اس سے ملک زیادہ آباد ہو گا. اور اس سے آمدنی زیادہ ہو گی۔ (۱)

اسی اصول کو امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

لا يزول ملك المالك إلا أن يشاء. ولا يملك رجل شيئا إلا في الميراث .... قال الله عزّ و جلّ: لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم ..... فلم أعلم أحدا من المسلمين خالف في أنه لا يكون على أحد أن يملك شيئاً إلا أن يشاء أن يملكه إلا الميراث .... و لم أعلم أحدا من المسلمين اختلفوا في أن لا يخرج ملك المالك المسلم من يديه إلا بإخراجه إياه بنفسه ببيع. أو هبة. أو غير ذالك.

کسی مالک کی ملکیت زائل نہیں ہو سکتی جب تک وہ خود نہ چاہے. اور کسی شخص کو کسی چیز کا زبردستی مالک نہیں بنایا جا سکتا جب تک وہ خود نہ چاہے. اس میں صرف میراث کا مال مستثنیٰ ہے ••••••اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ. الا یہ کہ تمہاری باہمی رضا مندی سے کوئی تجارت ہو. ••••• لہٰذا مجھے مسلمانوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا معلوم نہیں ہے جس نے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہو. کہ کسی شخص کو اس کی خواہش کے بغیر کسی چیز کا مالک نہیں

---

(۱) کتاب الخراج للامام ابی یوسف. ص ۶۰. ۶۱ فصل فی ذکر القطائع۔

بنایا جا سکتا. ...... اسی طرح مسلمانوں میں کوئی ایک شخص بھی مجھے ایسا معلوم نہیں ہے جس نے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہو کہ کسی مالک کی ملکیت اس کے ہاتھوں سے اس وقت تک نہیں نکالی جا سکتی جب تک وہ خود اسے نہ نکالے. خواہ بیع کے ذریعہ، یا ہبہ کے ذریعہ۔ (۱)

عالم اسلام کے مایہ ناز فقیہ، صوفی اور مفکر بزرگ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے بھی اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے کہ کیا کوئی حکومت مصالح عامہ کے تحت لوگوں کی املاک ان سے زبردستی چھین سکتی ہے یا نہیں؟

«فإن قال قائل: إذا رأى الإمام جمعا من الأغنياء يسرفون في الأموال ويبذرون. ويصرفونها إلى وجوه من الترفة و التنعم و ضروب الفساد. فلو رأى المصلحة في معاقبتهم بأخذ شيئ من أموالهم ورده إلى بيت المال. وصرفه إلى وجوه المصالح فهل له ذالك؟ قلنا: لا وجه له. فإن ذالك عقوبة بتنقص الملك وأخذ المال. والشرع لم يشرع المصادرة في الأموال عقوبة على جناية. مع كثرة العقوبات و الجنايات ..... والزجر حاصل بالطرق المشروعة».

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ جب امام (سربراہ حکومت) مال داروں کے ایک گروہ کو دیکھ رہا ہو کہ وہ اپنی املاک میں اسراف اور فضول خرچی سے کام لے رہے ہیں، اور ان کو عیش و آرام کے مختلف طریقوں اور طرح طرح کے اسباب فساد میں خرچ کر رہے ہیں، تو اگر وہ مصلحت اس میں سمجھے کہ اس عمل کی سزا کے طور پر ان سے ان کے کچھ اموال چھین لے، اور انہیں بیت المال میں داخل کر کے ان کو مصالح عامہ میں خرچ کرے تو کیا اسے یہ اختیار ہے؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ اس کا کوئی جواز نہیں، اس لئے کہ یہ سزا ملکیت میں کمی اور اموال کو چھین کر دی جا رہی ہے، اور شریعت نے کسی کے مال پر زبردستی قبضہ کرنے کو کسی جرم کی سزا کے طور بھی مقرر نہیں کیا. حالانکہ شرعی سزاؤں کی بہت سی قسمیں ہیں. ..... جہاں تک فساد سے

---

(۱) کتاب الام للامام الشافعیؒ. ج ۳ ص ۲۱۸ و ۲۱۹۔

لوگوں کو روکنے کا تعلق ہے۔ یہ مقصد ان طریقوں کو اختیار کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے۔ (۱)

تاریخ اسلام کے دوسرے عظیم مفکر علامہ ابن خلدون جن کو عمرانی علوم کا مدون اول کہنا چاہئے، اپنے شہرہ آفاق مقدمے میں اس بات پر مفصل بحث کرتے ہیں کہ حکومت کو بلامعاوضہ لوگوں کی املاک چھیننے کا اختیار دینے سے سیاسی اور معاشی اعتبار سے کیا فساد رونما ہوتا ہے؟ ان کے مقدمہ کی چھتیسویں فصل اسی موضوع کے لئے مختص ہے۔ اور پوری مطالعہ کے لائق ہے تاہم اس کے چند فقرے ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں:

"اعلم أن العدوان على الناس في أموالهم ذاهب بآمالهم في تحصيلها و اكتسابها لما يرونه حينئذ من أن غايتها و مصيرها انتهابها من أيديهم و إذا ذهبت آمالهم في اكتسابها و تحصيلها انقبضت أيديهم عن السعي في ذالك. و على قدر الاعتداء و نسبته يكون انقباض الرعايا عن السعي في الاكتساب .... و العمران. و وفوره و نفاق أسواقه إنما هو بالأعمال و سعي الناس في المصالح و المكاسب ذاهبين و جائين. فإذا قعد الناس عن المعاش و انقبضت أيديهم عن المكاسب كسدت أسواق العمران.

یاد رکھو کہ لوگوں کی املاک پر دست درازی سے مال کی تحصیل و اکتساب کی امنگ لوگوں کے دل سے ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خواہ کتنا مال کما لیں، بہرصورت وہ ہمارے ہاتھ سے چھن جائے گا۔ اور جب کسب مال کے سلسلے میں ان کی امنگ ختم ہو جاتی ہے تو ان کے ہاتھ معاشی جدوجہد سے رک جاتے ہیں۔ چنانچہ مال پر دست درازی جتنی ہو گی اسی نسبت سے عوام کی معاشی جدوجہد میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔ ..... اور عمرانی اور بازاروں کی سرگرمی دراصل لوگوں کی معاشی جدوجہد سے وابستہ ہوتی ہے۔ جب لوگ معاشی جدوجہد میں سست پڑ جائیں۔ اور ان کے ہاتھ کمائی سے رک جائیں۔ تو آبادی کے بازار ویران ہو جاتے ہیں۔ (۱)

---

(۱) شفاء الغلیل للامام الغزالی ص ۲۴۳ تا ۲۴۵ بحوالہ "الملکیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ" للدکتور عبدالسلام العبادی ص ۲۸۲ ج ۲

(۱) مقدمہ ابن خلدون، ص ۲۸۶، فصل نمبر ۳۶، مطبوعہ مکتبہ تجاریہ، مصر۔

یہ چند اقتباسات محض نمونے کے طور پر پیش کئے گئے ہیں، ورنہ ہر فقہ کی کتاب میں یہ صراحت موجود ہے کہ کسی بھی شخص کی ملک کو بلامعاوضہ لے لینا کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ کوئی فرد ہو یا حکومت۔ اور جیسا کہ پیچھے متعدد حوالوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس مسئلے پر ہر دور میں اور ہر مکتب فکر کے فقہاء متفق رہے ہیں۔

۹۲۔ تاریخ اسلام میں بھی بعض واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ بعض حکومتوں نے مصالح ہی کے نام پر لوگوں کی اراضی پر بلامعاوضہ قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس زمانہ کے فقہاء نے نہ صرف یہ کہ اسے ناجائز قرار دیا، بلکہ اس پر احتجاج کیا، یہاں تک کہ انہیں یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ ایک مرتبہ مصر کے حکمران سلطان ظاہر بیبرس نے اراضی کو لوگوں سے چھیننے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جو لوگ صدیوں سے اراضی کے مالک چلے آرہے تھے، ان کو اس بات کا پابند کیا کہ وہ اپنی اپنی اراضی کی اسناد ملکیت دکھائیں، اور ارادہ یہ تھا کہ جو لوگ ملکیت کا کوئی دستاویزی ثبوت پیش نہ کر سکیں، ان سے زمین چھین کر بیت المال میں داخل کر دی جائے۔ حالانکہ معروف شرعی اصول یہ ہے کہ جو شخص عرصہ دراز سے کسی چیز پر مالکانہ تصرفات کرتا چلا آرہا ہو، اور کسی بھی قرینے سے اس کی ملکیت مشتبہ نہ ہو، اس کی ملکیت کا بار ثبوت (Onus of Proof) اس کے ذمہ نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص اس کی ملکیت کو چیلنج کرتا ہے، تو بار ثبوت اس کے ذمے ہے۔

اس دور میں مصر کے معروف شافعی عالم جو اپنے علم و فضل، تفقہ اور تقویٰ میں معروف ہیں، علامہ محی الدین نوری رحمتہ اللہ علیہ تھے، انہوں نے اس پر شدید احتجاج کیا یہاں تک کہ شاہ ظاہر بیبرس کو اپنا یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ اس واقعے کی تفصیل ان الفاظ میں بتاتے ہیں:

«وسبقه إلى ذالك الملك الظاهر بيبرس، فإنه أراد مطالبة ذوى العقارات بمستندات تشهد لهم بالملك، وإلا انتزعها من أيديهم متعالا بما تعلل به ذالك الظالم، فقام عليه شيخ الإسلام الإمام النووى رحمه الله تعالى و أعلمه بأن ذالك غاية الجهل و العناد، وأنه لا يحل عند أحد من علماء المسلمين، بل من في يده شيئى فهو ملكه، لا يحل لأحد اعتراض عليه ولا يكلف إثباته ببينة، ولا زال النووى رحمه الله تعالى يشنع على السلطان و يعظه إلى أن كف عن ذالك».

اس سے پہلے شاہ ظاہر بیبرس نے بھی ایسا ہی کیا تھا. ان کا ارادہ ہوا تھا کہ وہ زمین کے مالکوں سے ایسی دستاویزات کا مطالبہ کریں جو ان کی ملکیت کی شہادت دیتی ہوں. ورنہ وہ زمینیں ان سے چھین لی جائیں. اس غرض کے لئے اس ظالم نے متعدد وجوہ کا سہارا لیا تھا. لیکن شیخ الاسلام امام نووی ؒ اس کے مقابلے پر کھڑے ہو گئے. اور اسے بتایا کہ ایسا کرنا انتہا درجے کی جہالت اور دھاندلی ہے. مسلمان علماء میں سے کسی کے نزدیک بھی ایسا کرنا حلال نہیں، بلکہ جو چیز جس شخص کے قبضے میں ہوتی ہے. وہ اس کی ملکیت ہے. کسی شخص کو اس پر اعتراض کر کے مالک کو ملکیت کی گواہی پیش کرنے کا حق نہیں پہنچتا. امام نووی سلطان کے اس ارادے کی تردید اور اسے نصیحت کرنے میں اس وقت تک مشغول رہے. جب تک وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آ گیا۔ (۱)

بہر صورت. قرآن و سنت. اجماع امت اور فقہاء اسلام کی تصریحات کی روشنی میں اس بات کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی کہ جس شخص کی ملکیت کسی زمین پر جائز طریقے پر ثابت ہو. اس سے وہ زمین بلا معاوضہ زبردستی ضبط کر لی جائے۔

۹۳۔ اب میں ان روایات کا مختصر جائزہ لینا چاہتا ہوں. جن کی بنیاد پر وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں یا ہمارے سامنے بحث کے دوران یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ مصالح عامہ کے پیش نظر کسی کی ملکیت بلا معاوضہ لے لینا اسلامی حکومت کے لئے جائز ہے:

حضرت عمرؓ کی پالیسی

۹۴۔ وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں اس ضمن میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ کا ایک ارشاد پیش کیا گیا ہے. جس کا ترجمہ اس فیصلے میں اس طرح مذکور ہے:

"If I had an opportunity to do what I had already done (to continue my policies) I would have taken from the rich their surplus wealth and distributed it aming the needy"

یعنی: "اگر مجھے (اپنی پالیسی جاری رکھتے ہوئے) وہ کچھ کرنے کا موقع ملا جو میں

(۱) رد المحتار لابن عابدین. ص ۲۸۱ ج ۳. مطبوعہ کوئٹہ. کتاب الجہاد باب العشر والخراج۔

پہلے سے کرتا رہا ہوں، تو میں مال دار لوگوں سے ان کی فاضل دولت لے کر اسے محتاج لوگوں میں تقسیم کر دوں گا"

حضرت عمر کے اس مبینہ ارشاد کے بارے میں چند وضاحتیں ضروری ہیں:

(۱) اس ارشاد کا جو ترجمہ فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں کیا گیا ہے، وہ درست نہیں ہے، کیونکہ اس ترجمے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مال داروں سے ان کا فاضل مال لے کر غریبوں میں تقسیم کرنا حضرت عمرؓ کی مسلسل پالیسی تھی جس پر وہ عمل کرتے رہے. اور آئندہ بھی اسی پالیسی کو جاری رکھنے کا عزم ظاہر کیا. حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے. وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں حضرت عمر کا یہ فقرہ نجات اللہ صدیقی صاحب کی کتاب "اسلام کا نظریہ ملکیت" سے نقل کیا گیا ہے. انہوں نے تاریخ طبری کے حوالے سے اس اصل عربی الفاظ بھی لکھ دیئے ہیں. جو اس طرح ہیں:

«لو استقبلت من أمري ما استدبرت لأخذت فضول أموال الأغنياء فقسمتها على فقراء المهاجرين».

عربی محاورے کی رو سے اس فقرے کا صحیح ترجمہ یہ ہو گا:

"اگر شروع میں میری رائے وہ ہو جاتی جو بعد میں ہوئی تو میں مال داروں کا فاضل مال لے کر اسے محتاج مہاجرین میں تقسیم کر دیتا"

تاریخ طبری کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، اس مترجم نے مذکورہ جملے کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

"اگر مجھے ان باتوں کا پہلے پتہ چل جاتا جو مجھے بعد میں معلوم ہوئیں. تو میں دولت مندوں کے زائد مال و دولت کو حاصل کر کے انہیں غریب مہاجرین میں تقسیم کر دیتا" (۲)

اگرچہ عربی دان حضرات سمجھ سکتے ہیں کہ یہ ترجمہ بھی عربی محاورے کے پوری طرح مطابق نہیں ہے، تاہم اس ترجمے کے مقابلے میں بہتر ہے جو وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے یا نجات اللہ صدیقی صاحب کی کتاب میں کیا گیا ہے. اور اس ترجمہ سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حضرت عمرؓ کا صرف ایک خیال تھا. ان کی ایسی پالیسی نہیں تھی. جس پر وہ عمل کرتے رہے ہوں. اور جیسا کہ میں آگے ذکر کروں گا. حضرت عمرؓ نے حالات کے جس پس منظر میں یہ بات ارشاد فرمائی. اس کے پیش

---

(۱) تاریخ طبری. ص ۲۹۱ ج ۳. مطبوعہ قاہرہ، ۱۳۵۷ھ واقعات ۲۳ھ

(۲) تاریخ طبری اردو. مترجم حافظ رشید ارشد. ص ۲۸۶ ج ۳ - مطبوعہ نفیس اکیڈیمی. کراچی ۱۹۶۷ء

نظر ترجمے کی اس غلطی سے بڑی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ تنبیہ مناسب ہے کہ یوں تو پیش کردہ حوالوں کی صحت ہر علمی اور تحقیقی کام میں انتہائی ضروری ہے، لیکن عدالتی فیصلوں، بالخصوص اس اہم اختیار سماعت (Jurisdiction) میں جو وفاقی شرعی عدالت یا سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بینچ کو حاصل ہے، اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے، لہٰذا جہاں تک ممکن ہو، اس میں بالواسطہ حوالوں (Indirect References) اور غیر مستند ترجموں پر پرہیز کرنا چاہئے۔

(۲) حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد حدیث کی معروف اور مستند کتابوں میں سے کسی کتاب میں مجھے نہیں ملا، یہ ایک تاریخی روایت ہے جو تاریخ طبری میں بیان ہوئی ہے، علامہ ابن حزمؒ نے بھی محلی (۱) میں اسے نقل کیا ہے، لیکن انہوں نے اس کی پوری سند ذکر نہیں کی، بلکہ اپنے سے تقریباً دو صدی پہلے کے محدث عبدالرحمٰن بن مہدی سے اسے نقل کیا ہے، تاریخ طبری میں اس کی پوری سند مذکور ہے، اس کی استنادی حیثیت کو بعض محققین نے مشکوک بتایا ہے۔ (۲)

(۳) اگر حضرت عمرؓ کا یہ قول مستند طریقے پر ثابت ہو جائے تو یہاں یہ قول سیاق و سباق سے کاٹ کر نہایت مجمل طریقے پر بیان ہوا ہے، حضرت عمرؓ نے یہ بات کن حالات میں ارشاد فرمائی، کیا وہ دولت مند افراد کا سارا مال غریبوں میں تقسیم کرنا چاہتے تھے، یا اس کی کوئی حد ان کے ذہن میں تھی؟ مذکورہ روایت میں ان میں سے کوئی بات بھی واضح نہیں ہے۔

رمادہ کی قحط سالی

حضرت عمرؓ کے زمانے کے حالات اور ان کے دوسرے ارشادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عمر نے یہ بات اس شدید قحط سالی کے بعد ارشاد فرمائی تھی جو "عام الرمادہ" کے نام سے مشہور ہے، اور جس میں ہزارہا افراد کے بھوک سے مر جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا، امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کر کے اس قحط کے حالات اور اس کے بارے میں حضرت عمرؓ کا ارشاد اس طرح بیان فرمایا ہے:

---

(۱) محلی لابن حزم ص ۲۲۷ ج ۶۔

(۲) ملاحظہ ہو: ڈاکٹر عبدالسلام العبادی کی کتاب "الملکیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ"۔ ظ ۲۶۶ ج ۲، بحوالہ "نظرات فی کتاب اشتراکیۃ الاسلام" للشیخ محمد الحامد، ص ۱۲۹ و ۱۳۰۔

"إن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال عام الرمادة . وكانت سنة شديدة ملمة بعد ما اجتهد في إمداد الأعراب بالإبل و القمح و الزيت من الأرياف كلها حتى بلحت الأرياف كلها مما جهد ها ذالك . فقام عمر يدعو، فقال : اللهم اجعل رزقهم على رئوس الجبال . فاستجاب الله له و للمسلمين . فقال : حين نزل به الغيث : الحمد لله . فوالله لو أن الله لم يفرجها ما تركت بأهل بيت المسلمين لهم سعة إلا أدخلت معهم أعدادهم من الفقراء فلم يكن اثنان يهلكان من الطعام على ما يقيم واحداً"

"حضرت عمر بن خطابؓ نے رمادہ کے سال میں فرمایا اور یہ بڑا سخت مصیبت کا سال تھا، اور حضرت عمرؓ نے زر خیز علاقوں سے اونٹ، گندم اور زیتون منگوا کر دیہات کے لوگوں کی مدد فرمائی تھی، یہاں تک کے زرخیز علاقے اس امداد کے بار کی وجہ سے خشک ہو گئے، اس موقع پر حضرت عمرؓ نے دعا کی کہ یااللہ! ان کے لئے پہاڑوں کی چوٹیوں پر (برسنے والی بارش کے ذریعہ) رزق مہیا فرما، اللہ تعالیٰ نے ان کی اور مسلمانوں کی دعا قبول فرمائی، چنانچہ جب بارش ہو گئی تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: الحمد للہ، خدا کی قسم اگر اللہ تعالیٰ اس مصیبت کو دور نہ فرماتا تو میں کسی بھی کشادہ حال گھرانے کو نہ چھوڑتا جس میں اس کے افراد خاندان کی تعداد کے برابر فقرا کو ان کے ساتھ شامل نہ کر دیتا، کیونکہ جتنا کھانا ایک آدمی کے لئے کافی ہو سکتا ہے، اگر اس پر دو آدمی گزارہ کرتے تو ان میں کوئی ہلاک نہ ہوتا" (۱)

"الادب المفرد" کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، اس میں بھی یہ روایت دیکھی جا سکتی ہے۔ (۱)

امام ابن سعد نے بھی حضرت عمرؓ کا یہ قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

---

(۱) (الادب المفرد، للامام البخاری ص ۸۲، ۸۳ باب نمبر ۲۵۳، فضل اللہ الصمد ص ۲۴، ۲۵ ج۲)

(۱) الادب المفرد، ترجمہ مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی، ص ۲۷۲، مطبوعہ دار الاشاعت، کراچی ۱۹۶۹ء

"لو لم أجد للناس من المال ما يسعهم إلا أن أدخل على كل أهل بيت عدتهم ، فيقاسمونهم أنصاف بطونهم حتى يأتي الله بحيا فعلت ، فإنهم لن يهلكوا عن أنصاف بطونهم".

اگر مجھے اتنا مال نہ ملتا جو لوگوں کی ضرورت پوری کر دے، اور لوگوں کی حاجت روائی کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہ ہوتی کہ میں ہر گھرانے میں اس کے افراد کے برابر دوسرے افراد کو داخل کر دوں، تاکہ وہ سب آدھی آدھی خوراک تقسیم کر کے کھائیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بارش عطا فرمائے، تو میں ایسا ہی کر گزرتا، کیونکہ لوگ آدھا پیٹ کھانے کی وجہ سے ہلاک نہ ہو جاتے۔ (۲)

یہ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا ارشاد کا پس منظر، یعنی شدید قحط سالی کے اس زمانے میں جب ہزارہا افراد کے بھوکے مرنے کا اندیشہ تھا، آپ نے یہ ارادہ فرمایا تھا کہ خوشحال لوگوں کو اس بات کا پابند بنا دیں کہ وہ اپنے افراد خاندان کے برابر دوسرے افراد کو بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا کریں، لیکن چونکہ یہ خیال آپ کو اس وقت آیا جب قحط سالی ختم ہو چکی تھی، اس لئے آپ کو اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

یہ صورت حال ہمارے زیر بحث مسئلے سے بالکل مختلف ہے، ہماری گفتگو اس صورت میں ہو رہی ہے جب مالکان اراضی نے اپنے تمام شرعی واجبات ادا کر دیئے ہوں، اور ان کی ملکیت بھی جائز ہو، سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت میں ان کی زمینیں بلامعاوضہ ان سے لی جا سکتی ہیں؟ حضرت عمرؓ کے اس ارشاد سے ایسے مواقع پر بلامعاوضہ زمینیں لے لینے کا کوئی جواز معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ حضرت عمرؓ نے دولت مند افراد پر جو ذمہ داری عائد کرنے کا ارادہ فرمایا تھا، وہ ان کے شرعی واجبات کا ایک حصہ تھی۔

بھوک مٹانے کی شرعی ذمہ داری

۹۵۔ قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کی تصریحات میں یہ بات واضح ہے کہ اگر کسی بھی مسلمان کو کوئی ایسا انسان ملے جو بھوک سے بیتاب ہو، اور اس کے پاس بھوک مٹانے کا کوئی سامان نہ ہو، تو اس پر شرعاً واجب ہے کہ اس کی بھوک مٹانے کا سامان کرے، یہ محض اس کا احسان

---

(۲) طبقات ابن سعد، ص ۳۱۶ ج ۳، مطبوعہ دار صادر، بیروت، احوال سیدنا عمر بن خطابؓ۔

نہیں ہے، بلکہ اس کی شرعی ذمہ داری ہے، چنانچہ قرآن کریم نے جابجا اس کا حکم دیا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

«فلا اقتحم العقبة وما أدراك ما العقبة فك رقبة أو إطعام في يوم ذي مسغبة يتيماً ذا مقربة أو مسكيناً ذا متربة».

پس وہ شخص گھاٹی میں کیوں نہ گھس گیا؟ اور تمہیں کیا معلوم کہ گھاٹی کیا ہے؟ کسی کی گردن چھڑانا، یا کسی بھوک والے دن میں کسی قرابت دار یتیم یا کسی خاک آلود مسکین کو کھانا کھلانا۔ (۱)

اسی طرح قرآن کریم نے جہنمیوں کی زبانی ان کے جہنم میں جانے کے اسباب بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

«لم نك من المصلين و لم نك نطعم المسكين».

ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھے، اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ (۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں اس کا حکم دیا ہے، حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا:

فكوا العاني ، يعني الأسير ، أطعموا الجائع .

(جنگی) قیدی کو چھڑاؤ، اور بھوکے کو کھانا کھلاؤ۔ (۱)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أيما أهل عرصة أصبح فيهم امرؤ جائع فقد برئت منهم ذمة الله تعالى .

جس کسی احاطے کے لوگ اس حالت میں صبح کو بیدار ہوں کہ ان کے درمیان کوئی شخص بھوکا ہو تو ایسے لوگوں سے اللہ تعالیٰ کا ذمہ بری ہے۔ (۲)

اسی طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) سورۃ البلد، آیت ۱۱ تا ۱۶۔

(۲) سورۃ المدثر ۷۴: ۴۳ و ۴۴۔

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجہاد، باب نمبر ۱۷۱، حدیث نمبر ۳۰۴۶۔

(۲) مسند احمد، ص ۳۳ ج ۲ مطبوعہ دار صادر، بیروت۔

«ليس بمؤمن من بات شبعان ـ وجاره جائع إلى جنبه»

وہ شخص مومن نہیں ہے جو رات کو پیٹ بھر کر سوئے اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا ہو۔ (۳)

قرآن و سنت کے ان ارشادات کی بنا پر امت کے تقریباً تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ جو شخص بھی کسی کو بھوکا پائے، اسے کھانا کھلانا اس پر واجب ہے، اور اگر قحط کا زمانہ ہو جس میں بہت سے لوگ بھوکے ہوں تو ان کی بھوک مٹانا اس علاقے کے خوش حال لوگوں پر فرض کفایہ ہے، اس سلسلے میں چند فقہاء کی تصریحات درج ذیل ہیں:

امام ابو بکر جصاص رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

«إن المفروض إخراجه هو الزكاة ـ إلا أن تحدث أمور توجب المساواة و الإعطاء ـ نحو الجائع المضطر ـ والعاري المضطر ـ أو ميت ليس له من يكفنه أو يواريه ـ

مال کا جو حصہ نکالنا مالک کے ذمہ واجب ہے، وہ زکوٰۃ ہی ہے، الا یہ کہ ایسے امور پیش آ جائیں جو غم خواری اور دینے کو واجب کر دیں، مثلاً کوئی بھوکا اضطرار کی حالت میں سامنے آ جائے، یا کوئی ننگا مضطر ہو، یا کوئی میت ہو جس کے کفن دفن کا کوئی انتظام نہ ہو۔ (۱)

فقہ حنفی کی مشہور کتاب "الاختیار" میں علامہ موصلیؒ لکھتے ہیں:

من اشتد جوعه حتى عجز عن طلب القوت ـ ففرض على كل من علم به أن يطعمه ـ أو يدل عليه من يطعمه ـ صونا له عن الهلاك ـ فإن امتنوا عن ذالك حتى مات اشتركوا في الإثم»۔

کوئی شخص شدید بھوک میں مبتلا ہو، اور گزارے کے لائق غذا کی تلاش سے عاجز ہو چکا ہو، تو ہر وہ شخص جسے اس بات کا علم ہو، اس پر فرض ہے کہ اسے کھانا کھلائے، تاکہ وہ ہلاکت سے بچ سکے، اگر تمام لوگ اس فریضہ کی ادائیگی سے باز رہے، یہاں تک کہ وہ شخص مر گیا، تو گناہ میں سب شریک ہوں گے۔ (۲)

(۳) مشکوٰۃ شریف۔ ص ۴۲۴، کتاب الادب، باب الشفقة والرحمة على الخلق، بحوالہ بیہقی فی شعب الایمان۔

(۱) احکام القرآن للجصاص، ص ۱۰۶ ج ۳، مطلب فی زکاۃ الذہب والفضۃ۔

(۲) الاختیار لتعلیل المختار، ص ۱۷۵ ج ۴، کتاب الکراہیۃ۔ فصل فی الکسب۔

شافعی مذہب کے مشہور عالم علامہ رملیؒ ان افعال کی فہرست شمار کراتے ہوئے جو مسلمانوں پر فرض کفایہ ہیں، تحریر فرماتے ہیں:

ودفع ضرر المسلمین و أهل الذمة ککسوة عار ما یستر عورته. أو یقی بدنه مما یضره. و إطعام جائع إذا لم یندفع ذالك الضرر بزکاة وسهم المصالح من بیت المال. لعدم شیئ فیه. أو لمنع متولیة ولو ظلما .... و منه یؤخذ أنه لو سئل قادر فی دفع ضرر لم یجزله الامتناع و إن کان هناك قادر آخر».

اسی طرح مسلمانوں اور ذمیوں (اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں) سے ضرر دفع کرنا بھی فرض کفایہ ہے، مثلاً کسی ننگے کو اتنا لباس دینا جس سے وہ ستر عورت کر سکے، یا اپنے بدن کو مضر اثرات (گرمی یا سردی) سے بچا سکے، اور بھوکے کو کھانا کھلانا، جب کہ یہ ضرر زکوٰۃ سے اور بیت المال کے مصالح عامہ کی مد سے دور نہ ہو سکتا ہو، یا تو اس لئے کہ بیت المال میں کچھ موجود نہ ہو، یا اس لئے کہ اس کا منتظم دیتا نہ ہو، خواہ وہ ظلماً ایسا کر رہا ہو، ...... اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر کوئی شخص جو اس ضرر کو دفع کرنے پر قادر ہے، اگر اس سے اس بات کا مطالبہ کیا جائے (کہ اس ضرر کو دور کرنے پر خرچ کرے) تو اس کے لئے انکار کرنا جائز نہیں، خواہ وہاں کوئی دوسرا شخص بھی موجود ہو، جو خرچ کرنے پر قادر ہے۔ (۱)

اور امام غزالیؒ تحریر فرماتے ہیں:

إذا أصاب المسلمین قحط أو جدب. وأشرف علی الهلاك جمع. فعلی الأغنیاء سد مجاعتهم و یکون فرضا علی الکفایة.

جب مسلمانوں کو قحط یا خشک سالی کا سامنا ہو، اور بہت سے لوگ ہلاکت کے کنارے پہنچ جائیں، تو ان کی بھوک کا انتظام کرنا مالدار لوگوں کی ذمہ داری ہے، اور یہ فرض کفایہ ہے۔ (۱)

---

(۱) نہایۃ المحتاج للرملی ص ۴۲ ج ۸. کتاب الجہاد، مطبوعہ بیروت

(۱) شفاء الغلیل ص ۲۴۲، بحوالہ "الملکیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ" از ڈاکٹر عبدالسلام العبادی، ص ۸۲ ج ۳۔

بہرصورت! بھوکے ننگے شخص کی فوری ضرورت کی تکمیل یا قحط سالی کے زمانے میں قحط زدہ افراد کی امداد تو ہر مسلمان کا شرعی فریضہ ہے. اگر کوئی شخص اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو وہ گناہ گار ہے. اور ایسی صورت میں اسلامی حکومت اسے اس فریضے کی ادائیگی پر مجبور بھی کر سکتی ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے جس ارادے کا اظہار فرمایا وہ اس اصول کے عین مطابق ہے. جو قرآن و سنت کی روشنی میں فقہاء امت کے درمیان طے شدہ ہے. لیکن اس سے مذکورہ ایمرجنسی کے بغیر کسی شخص کی جائز املاک پر بلا معاوضہ زبردستی قبضہ کرنے کا جواز ہرگز ثابت نہیں ہوتا. کیونکہ ہماری تمام تر گفتگو دو مفروضات کی بنیاد پر ہو رہی ہے. ایک یہ کہ مالک کی ملکیت شرعی اعتبار سے جائز ہو. اور دوسرے یہ کہ وہ اپنی املاک پر عائد ہونے والے تمام شرعی واجبات ادا کرتا ہو. قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کے جو دلائل پیچھے بیان کئے گئے ہیں، ان کی رو سے ایسے شخص کی کسی بھی مملوکہ چیز کو بلا معاوضہ زبردستی اس کی ملکیت سے نکالنا جائز نہیں. ہاں اس کو تمام شرعی واجبات ادا کرنے پر بزور قانون مجبور کیا جا سکتا ہے. جن میں قحط زدہ افراد کی خوراک بھی شامل ہے۔

فاضل مال کو خرچ کرنے کا حکم۔

۹۶۔ یہیں سے ایک اور نکتے کی بھی وضاحت ہو سکتی ہے، جو ہمارے سامنے بحث کے دوران اٹھایا گیا. اور وہ یہ کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

«یسئلونك ما ذا ینفقون قل العفو»

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے جو (ضرورت سے) فاضل ہو" (۱)

نکتہ یہ اٹھایا گیا کہ اس آیت سے تمام لوگوں کو ضرورت سے زائد مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے. اگر لوگ از خود اس حکم کی تعمیل نہ کر رہے ہوں، اور حکومت اس پر عمل کرانے کے لئے ان کا فاضل مال ان سے لے کر غریبوں میں تقسیم کر دے تو اس میں کیا حرج ہے؟

اس سوال کا جواب اس بات پر موقوف ہے کہ قرآن کریم کا یہ ارشاد (کہ زائد از ضرورت مال خرچ کر دو) کوئی وجوبی حکم (Maneatory order) ہے. یا استحبابی حکم ہے؟ اگر وجوبی حکم ہے تو بلاشبہ زائد از ضرورت مال کا خرچ کرنا شرعی واجبات میں شامل ہو گیا، اس لئے بزور قانون اس کی تعمیل کرانے کا اختیار حکومت کو ہو گا. لیکن اگر یہ کوئی استحبابی حکم ہے. جسے مالکان کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے. تو پھر یہ شرعی واجبات میں داخل نہ ہو گا. اس لئے حکومت کو اس پر بزور

(۱) البقرۃ ۲: ۲۱۹۔

قانون مجبور کرنے کا اختیار نہیں ہو گا. لہٰذا پہلے اس بات کی تحقیق کر لینا مناسب ہے، کہ یہ حکم کس نوعیت کا ہے؟

"قل العفو" کا صحیح مطلب

اس آیت قرآنی کا سیاق و سباق، اور اسکے نزول کا پس منظر واضح طور پر بتا رہا ہے کہ یہ کوئی وجوبی حکم نہیں ہے، ترغیبی اور استحبابی نوعیت کا حکم ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ حکم از خود نازل نہیں ہوا، بلکہ صحابہ کرام کے سوال کے جواب میں نازل ہوا ہے، چنانچہ آیت کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے، "لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟" یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ کچھ لوگ اپنا مال اپنی مرضی سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہتے تھے، لیکن وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ کتنا مال خرچ کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ جو مال تمہاری ضرورت سے زائد ہو، اس کی جو مقدار بھی خرچ کرو گے، موجب اجر و ثواب ہو گی، اس سوال کے جواب کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ جب قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے فضائل نازل ہوئے، تو بعض صحابہ کرام ان فضائل کو حاصل کرنے کے جوش میں اپنا سارے کا سارا مال خرچ کر دیتے تھے، اور خود ان کے اور ان کے اہل و عیال کے لئے کچھ نہ بچتا تھا، ان کا یہ جذبہ تو بلاشبہ قابل قدر تھا، لیکن اس طرح نفلی صدقہ کرنے کی بنا پر چونکہ خود اپنے نفس اور اپنے بیوی بچوں کا واجب حق پامال ہوتا تھا، اس لئے قرآن و سنت نے انہیں اس سے روکا، اور یہ بتایا کہ نفلی صدقہ اسی مال سے خرچ کرو جو تمہارے اور تمہارے اہل و عیال کی ضرورت سے زائد ہو۔

یہ بات ان حدیثوں سے مزید واضح ہو جاتی ہے، جو حافظ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں ذکر فرمائی ہیں:

(۱) عن جابر بن عبداللہ قال: أتی رسول اللہ ﷺ رجل ببیضة من ذهب أصابها فی بعض المعادن. فقال: یا رسول اللہ! خذ هذه منی صدقة. فواللہ ما أصبحت أملك غیرها. فأعرض عنه. فأتاه من رکنه الأیمن. فقال له مثل ذالك. فأعرض عنه. ثم قال له مثل ذالك. فأعرض عنه. ثم قال له مثل ذالك. فقال: هاتها مغضبا. فأخذها

فحذفه بها حذفة لو أصابه شجه، أو عقره، ثم قال: يجيئى أحدكم بماله كله يتصدق به، و يجلس يتكفف الناس، إنما الصدقة عن ظهر غنى.

حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص سونے کا ایک انڈا لے کر آیا جو اس نے کسی کان سے حاصل کیا تھا، آکر عرض کیا یا رسول اللہ: یہ مجھ سے صدقہ کے طور پر (خرچ کے لئے) لے لیجئے، کیونکہ خدا کی قسم آج کی صبح میں اس کے سوا کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا، پھر وہ دائیں جانب سے آیا، اور وہی بات پھر کہی، آپ نے پھر منہ موڑ لیا، اس نے پھر وہی بات دہرائی، آپ نے پھر منہ موڑ لیا، اس شخص نے پھر وہی بات کہی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضگی کے انداز میں فرمایا: "لاؤ" یہ کہہ کر سونا اس سے لے لیا، پھر اسے اسی کی طرف اس انداز میں پھینکا کہ اگر وہ اسے لگ جاتا تو اسے چوٹ لگ جاتی، پھر فرمایا: تم میں سے بعض لوگ اپنا سارے کا سارا مال صدقہ کرنے کے لئے اٹھا لاتے ہیں، پھر دوسروں کے دست نگر بن کر بیٹھ جاتے ہیں، (قابل ثواب) صدقہ تو وہ ہے جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد ہو۔

(۲) عن جابر بن عبدالله، قال: قال رسول الله ﷺ: إذا كان أحدكم فقيراً فليبدأ بنفسه، فإن كان له فضل فليبدأ مع نفسه بمن يعول، ثم إن وجد فضلا بعد ذالك فليتصدق على غيرهم.

حضرت جابرؓ ہی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص محتاج ہو تو سب سے پہلے اپنے نفس پر خرچ کرے، اگر اپنے نفس پر خرچ کرنے کے بعد کچھ بچ جائے تو اپنے نفس کے ساتھ ان لوگوں سے شروع کرے جن کی کفالت اس کے ذمہ ہے، اگر پھر بھی کچھ بچ جائے تو اسے صدقہ کرے۔

(۳) عن أبي هريرة قال: قال رجل: يا رسول الله! عندي دينار، قال: أنفقه على نفسك، قال: عندي آخر، قال: أنفقه على أهلك،

قال : عندی آخر، قال : أنفقه علی ولدك . قال : عندی آخر. قال : فأنت أبصر.

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس ایک دینار ہے، آپ نے فرمایا کہ اسے اپنے اوپر خرچ کر، اس نے کہا کہ میرے پاس اس کے علاوہ ایک اور بھی ہے، آپ نے فرمایا کہ اپنے گھر والوں پر خرچ کر، اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور ہے، آپ نے فرمایا کہ اسے اپنی اولاد پر خرچ کرو، اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور بھی ہے، آپ نے فرمایا کہ اس کے بارے میں تم ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہو۔ (۱)

ان تمام احادیث سے واضح ہے کہ حالات کے جس پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی ہے، وہاں صورت حال یہ نہیں تھی کہ لوگ کم خرچ کر رہے تھے، اور انہیں زیادہ خرچ کرنے کا حکم دینے کے لئے یہ فرمایا گیا کہ تم فاضل مال صدقہ کر دو، بلکہ صورت حال یہ تھی کہ لوگ اپنی استطاعت سے کہیں زیادہ صدقہ کر رہے تھے، اور انہیں اعتدال کی اس کم ترین حد پر لانا مقصود تھا کہ وہ کم از کم اپنے اور اپنے گھر والوں کی ضروریات کو پورا کر لیں ـــــ دوسرے الفاظ میں سوال کرنے والوں کا منشا یہ نہیں تھا کہ ہمارے اوپر کتنا خرچ کرنا واجب ہے؟ بلکہ پوچھنا یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتنا صدقہ ہمارے لئے جائز ہے؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ "جتنا ضرورت سے زائد ہو" اس کا خرچ کرنا جائز ہے، اس سے آگے اپنے زیر کفالت بیوی بچوں کا حق مار کر خرچ کرنا جائز نہیں۔

چنانچہ حافظ ابن جریر طبری رحمتہ اللہ علیہ اس آیت پر مفصل بحث کے بعد فرماتے ہیں:

«الصواب من القول فی ذالك ما قاله ابن عباس علی ما رواه عنه عطیه من أن قوله «قل العفو» لیس بإیجاب فرض من الله حقاً فی ماله ، ولکنه إعلام منه ما یرضیه من النفقة مما یسخطه جوابا منه لمن سأل نبیه محمداً ﷺ عما فیه له رضا ، فهو أدب من الله لجمیع خلقه علی ما أدبهم به فی الصدقة غیر المفروضات ، ثابت الحکم غیر ناسخ لحکم کان قبله بخلافه ، ولا

---

(۱) تفسیر ابن جریر، ص ۳۶۱ ج ۲، مطبوعہ بیروت، طبع جدید۔

منسوخ بحکم حدث بعده، فلا ینبغی لذی ورع و دین أن یتجاوز فی صدقات التطوع و هباته و عطایا النفل و صدقته ما أدبهم به نبیه ﷺ بقوله «إذا کان عند أحدکم فضل فلیبدأ بنفسه، ثم بأهله، ثم بولده، ثم یسلك حینئذ فی الفضل مسالکه التی ترضی الله ویحبها» و ذلك هو القوام بین الإسراف و الإقتار الذی ذکره الله عزو جل فی کتابه إن شاء الله تعالی»

اس آیت کی تفسیر میں صحیح بات وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمائی، اور جو ان سے امام عطیہ نے روایت کی ہے، وہ بات یہ ہے کہ قرآن کریم کا یہ ارشاد کہ "قل العفو" (کہہ دو جو زائد ہو) اس کا مقصد کوئی ایسا فریضہ عائد کرنا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مال پر وجوبی طور پر مقرر فرمایا ہو، بلکہ اس کا مقصد لوگوں کو یہ بتانا ہے کہ کونسا صدقہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور کونسا اللہ کی ناراضی کا موجب ہے، اور یہ بات ان لوگوں کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمائی گئی ہے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا تھا کہ کونسا صدقہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہے۔ لہٰذا اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی تمام مخلوق کو وہ ادب سکھایا گیا جس کی رعایت ان کو تمام غیر واجب صدقات میں رکھنی چاہئے، اس آیت کا حکم اب بھی برقرار ہے۔ نہ اس نے کسی سابقہ حکم کو منسوخ کیا، اور نہ اس کو کسی بعد والے حکم سے منسوخ کیا گیا، لہٰذا جو شخص بھی دیانت اور تقویٰ کا حامل ہو، اسے چاہئے کہ اپنے نفلی صدقات، ہبہ اور نفلی عطیات میں اس ادب کی رعایت رکھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں سکھایا ہے کہ "جب تم میں سے کسی کے پاس فاضل مال ہو تو وہ پہلے اپنے آپ سے ابتدا کرے، پھر اپنے گھر والوں سے، پھر اپنی اولاد سے، اس کے بعد بھی کچھ بچے تو پھر اس میں وہ راستے اختیار کرے جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والے ہیں، اور جنہیں وہ پسند کرتا ہے۔" ـــــ یہی اعتدال کا وہ راستہ ہے جو اسراف اور بخل کے درمیان ہے، اور جسے اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حکم دیا ہے" (۱)

(۱) تفسیر ابن جریر، ص۳۶۸ ج۲، طبع بیروت ۱۴۰۵ھ۔

اس تفصیل سے یہ بات کسی ادنی اشتباہ کیئے بغیر واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم کا مذکورہ بالا ارشاد ہے "جو ضرورت سے زائد ہو" واجب صدقہ کے ابتدائی حد کا نہیں، بلکہ جائز صدقے کی انتہائی حد کا بیان ہے۔ یعنی جائز طور سے جتنا مال نفلی صدقات میں خرچ کر سکتے ہو، اس کی آخری حد یہ ہے کہ وہ تمہاری ذاتی ضروریات سے زائد ہو، اس سے آگے بڑھ کر اتنا خرچ کرنا جس سے اپنے بیوی بچوں کا حق مارا جائے، تمہارے لئے جائز نہیں، کیونکہ ان کے حق کی ادائیگی تم پر واجب ہے، اور یہ صدقہ (جو زکوٰۃ کے علاوہ ہو۔) نفل اور مستحب ہے، اور نفل اور مستحب کی خاطر واجب کو چھوڑنا کسی طرح جائز نہیں۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ "زائد از ضرورت خرچ کرنے" کا مذکورہ حکم وجوبی نہیں، بلکہ استحبابی ہے، یعنی ہر شخص کے ذمے شرعاً یہ لازم نہیں ہے کہ وہ ضرورت سے زائد ہر چیز صدقہ کر دے، بلکہ ایسا کرنا مستحب ہے، تو اب اس کام کو بزور قانون لازم کرنا درست نہیں ہو سکتا۔

۹۷۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اسلامی حکومت مصالح عامہ کی خاطر کسی مباح کو لازم کر سکتی ہے، تو ایک مستحب کام کو لازمی قرار دیدینا تو اور زیادہ جائز ہونا چاہئے۔ لہٰذا اگر کسی قانون کے ذریعہ لوگوں پر یہ لازم کر دیا جائے کہ وہ اپنی فاضل دولت ضرور صدقہ کریں تو اس میں شرعاً کوئی حرج نہ ہونا چاہئے۔

میں اس مسئلے پر پہلے بحث کر چکا ہوں کہ ایک اسلامی حکومت کے لئے مباحات کو لازم کرنے کا اختیار کن حدود کا پابند ہے؟ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مستقل طور پر کسی حلال کو حرام کرنا یا کسی مباح کو واجب قرار دیدینا کسی کے لئے جائز نہیں، البتہ کسی وقتی مصلحت کی خاطر ایک اسلامی حکومت کسی مباح کام کے کرنے کا وقتی حکم جاری کر سکتی ہے، جس کی تعمیل واجب ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس حکم سے قرآن و سنت کے کسی دوسرے ارشاد کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔

بالکل یہی اصول مستحب امور میں بھی جاری ہو گا، یعنی کسی مستحب کام کو مستقل طور پر واجب قرار دینا کسی کے لئے جائز نہیں۔ لیکن کسی وقتی مصلحت کی خاطر اسلامی حکومت کی طرف سے عارضی طور پر کسی مستحب کام کا حکم دیا جا سکتا ہے، لیکن یہاں بھی شرط وہی ہو گی کہ اس سے قرآن و سنت کے کسی ارشاد کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔

زکوٰۃ کے علاوہ فاضل مال کو غریبوں پر خرچ کرنا بلاشبہ مستحب ہے، لیکن اگر کوئی حکومت اس مستحب کو بزور قانون لازم کرنے کے لئے ایک خاص حد سے زائد املاک لوگوں سے زبردستی چھینے تو اس سے احترام ملکیت سے متعلق قرآن و سنت کے ارشادات کی خلاف ورزی لازم آتی ہے جن کو

پیچھے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، اور وہاں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اعلیٰ درجے کی مصلحتوں کی خاطر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاضل دولت کو زبردستی لینا گوارا نہیں فرمایا، مثلاً بنو ہوازن کو غلام باندیاں لوٹانے کے لئے آپ نے لوگوں کو ترغیب ضرور دی، لیکن ساتھ ہی یہ واضح فرما دیا کہ جو شخص بلا معاوضہ دینے پر راضی نہ ہو تو وہ بلا تکلف کہہ دے، تاکہ اسے معاوضہ ادا کیا جائے۔ چنانچہ جو لوگ بلامعاوضہ دینے پر راضی نہ ہوئے، ان کو معاوضہ ادا کیا گیا، حالانکہ وہ غلام اور باندیاں "فاضل مال" کی تعریف میں یقیناً داخل تھیں، اور ان کو بنو ہوازن کی طرف لوٹانا یقینی طور پر مستحب تھا، اور آپ امت کے مجموعی مصالح کے پیش نظر اس کو ضروری بھی سمجھ رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے مالی حقوق کے سلسلے میں واجب اور مستحب کی جو واضح درجہ بندی فرمائی ہے۔ وہ ابدی حکمتوں پر مبنی ہے، مالی حقوق کا ایک حصہ فرض یا واجب ہے، اور اس کی ادائیگی پر مالک کو بزور قانون مجبور کیا جا سکتا ہے، یہ حصہ زکوٰۃ، عشر، صدقۃ الفطر، نفقات واجبہ وغیرہ پر مشتمل ہے، اور اسی میں کسی بھوکے ننگے شخص کی فوری ضرورت کی تکمیل بھی داخل ہے، جیسا کہ پیچھے بیان ہوا، ان حقوق واجبہ کے علاوہ لوگوں کی ہمدردی اور غم خواری کے لئے زیادہ سے زیادہ مال خرچ کرنے کو مستحب قرار دیا گیا ہے، اس کی ترغیب دی گئی ہے، لیکن اسے لازم نہیں کیا گیا۔

جہاں تک لوگوں کی ایسی لازمی ضروریات کا تعلق ہے، جن کے بغیر زندگی ممکن نہ ہو، وہ زکوٰۃ وغیرہ کے لازمی واجبات کے ذریعہ پورے ہو جاتے ہیں، بلکہ اگر زکوٰۃ و عشر کا نظام ٹھیک ٹھیک نافذ ہو تو نادار افراد کی صرف جینے کے لائق ضروریات ہی نہیں، بلکہ اس سے کچھ زیادہ ضروریات بھی پوری ہو جاتی ہیں، اب دولت کے تفاوت کو اعتدال پر لانے کا سوال رہ جاتا ہے، اس کے لئے ایک طرف تو آمدنی کے ذرائع پر پابندی عائد کر کے اور فضول خرچی پر پابندی لگا کر ایسا ماحول پیدا کیا گیا ہے جس میں بیجا ارتکاز دولت کم سے کم ہو، (جس کی کچھ تفصیل انشاءاللہ آگے آئے گی) اور دوسری طرف لوگوں کو رضا کارانہ طریقے سے اپنے بھائیوں پر خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی، اور اس پر آخرت کے اجر و ثواب کے عظیم وعدے کئے گئے ہیں، یہ دنیا چونکہ دارالامتحان ہے، اس لئے اس دائرے میں خرچ کرنے کو لازمی کرنے کی بجائے اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ لوگ قانون کے خوف سے نہیں، بلکہ اختیار اور اپنی خوشی سے یہ خدمت انجام دیں، اسے اللہ کی خوشنودی اور آخرت کے ثواب کا ذریعہ بنائیں، اور اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں ــــ اگر خرچ کے اس حصے کو بھی قانونی طور پر لازم کر دیا جائے تو اس سے یہ مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے، اور احترام ملکیت کا وہ اصول جس کی شریعت نے قدم قدم پر باریک بینی سے رعایت رکھی ہے، وہ

بھی پامال ہو جاتا ہے جس سے اسلام کا بنایا ہوا پورا معاشی ڈھانچہ تلپٹ ہو سکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حمیٰ

۹۸۔ فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں مصالح عامہ کی خاطر انفرادی جائیدادوں کو بلامعاوضہ ضبط کر لینے پر حضرت عمرؓ کے ایک اور عمل سے استدلال کیا گیا ہے۔ مذکورہ فیصلے کے متعلقہ فقرے کا ترجمہ یہ ہے:

"کم از کم ایک مثال ایسی موجود ہے جس میں حکومت کی طرف سے حاصل کی ہوئی جائیداد پر کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا گیا۔ یہ وہ واقعہ ہے جس میں حضرت عمرؓ نے شخصی ملکیت کی زمینوں کو عام چراگاہ کے طور پر استعمال کرنے کے لئے ضبط کیا۔ مالکان زمین نے اس عمل پر صرف احتجاج ہی نہیں کیا، بلکہ یہ بات زور دے کر کہی کہ ہم اسلام قبول کرنے سے پہلے کئی نسلوں سے ان زمینوں کے لئے لڑتے آئے ہیں۔ لیکن خلیفہ (حضرت عمرؓ) نے اس احتجاج کو رد کر دیا"

یہاں فاضل وفاقی شرعی عدالت نے جس واقعے کا ذکر کیا ہے۔ وہ حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن مذکورہ بالا فقرے میں اسے جس طرح بیان کیا گیا ہے، اس میں چند در چند غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، جن کی بنا پر واقعے کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے نہ کسی شخصی ملکیت کی جائیداد پر قبضہ کیا تھا، اور نہ اسے "چراگاہ" بنایا تھا۔ بلکہ انہوں نے غیر آباد اور غیر مملوک زمین کو گھیر کر اسے "حمی" بنا لیا تھا۔ یعنی اسے بیت المال کے مویشیوں کی چراگاہ کے لئے مخصوص کر لیا تھا، اور جن لوگوں نے ان پر اعتراض کیا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ غیر آباد زمین کسی کی ملکیت نہیں ہے، ہر شخص اس سے نفع اٹھا سکتا ہے۔ اور ہم کئی نسلوں سے اس سے اسی طرح فائدہ اٹھاتے چلے آئے ہیں، اب اسے بیت المال کے مویشیوں کے لئے مخصوص کر لینا آپ کے لئے جائز نہیں، حضرت عمرؓ نے ان کے اس موقف کی تردید فرمائی۔

اس واقعے کے پورے الفاظ صحیح بخاری وغیرہ میں موجود ہیں، لیکن اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے اس دور کے نظام اراضی کی چند باتیں ذہن میں رکھنی ضروری ہیں:

۹۹۔ اس دور میں کچھ زمینیں تو شخصی ملکیت میں ہوتی تھیں۔ ایسی زمینوں پر ان کے مالکان پوری طرح قابض اور متصرف ہوتے تھے۔ اور انہیں جس طرح چاہتے استعمال کرتے تھے، دوسری طرف زمینوں کا بیشتر حصہ غیر آباد اور غیر مملوک ہوتا تھا۔ اس میں خود رو گھاس اور جھاڑیاں وغیرہ ہوتیں۔ لیکن کھیتی باڑی نہیں ہوتی تھی۔ ایسی زمینوں کو "موات" (مردہ زمینیں) کہتے تھے۔ اور

ان کے بارے میں اصول یہ تھا کہ وہ نہ کسی فرد کی ذاتی ملکیت میں ہیں، نہ حکومت کی سرکاری ملکیت میں، ہاں جو شخص بھی محنت کر کے ان زمینوں کے کسی حصے کو کاشت وغیرہ کر کے آباد کر لیتا، وہ اس کا مالک قرار پاتا تھا، لیکن جب تک انہیں کسی نے آباد نہیں کیا، اس وقت تک وہ کسی کی ملکیت نہیں تھیں، بلکہ ہر شہری کو اس کی خود رو گھاس کی جھاڑیوں سے فائدہ اٹھانے کا حق ہوتا تھا، جو لوگ چاہتے وہاں اپنے مویشی چراتے، اور اس میں پائے جانے والے پانی سے اپنے مویشیوں کو سیراب کرتے، اور جو چاہتے، وہاں کی خود رو گھاس، جھاڑیوں یا درختوں کی لکڑیوں کو ایندھن کے طور پر استعمال کرتے، کسی پر روک ٹوک نہیں تھی، اس لئے ایسی زمینوں کو "اراضی مباحہ" یا "مباح عام" (Lands of Common public use) بھی کہا جاتا تھا، البتہ اسلام سے پہلے مذکورہ اصول کے ساتھ ساتھ ایک رواج یہ بھی تھا کہ اگر کوئی بااثر زمین دار یا کسی قبیلے کا رئیس ایسی "اراضی مباحہ" میں سے کسی زمین کو زیادہ سرسبز دیکھتا تو اس کی حد بندی کر کے یہ اعلان کر دیتا کہ میں نے اس زمین کو اپنے جانوروں کے لئے مخصوص کر دیا ہے، اب کسی اور کو یہاں مویشی چرانے کی اجازت نہیں ہوگی، عموماً حدبندی کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تھا کہ ایک کتے کو کسی بلند جگہ پر کھڑا کر دیا جاتا، وہاں سے اس کے بھونکنے کی آواز جتنی دور تک جاتی، وہاں تک کا علاقہ دوسروں کے لئے "ممنوعہ علاقہ" (Prohibited Area) قرار دیدیا جاتا تھا، اس "ممنوعہ علاقے" کو "حمی" کہا جاتا تھا، اور جب کوئی رئیس کسی "ارض موات" یا "ارض مباحہ" کو "حمی" بنالیتا تو دوسروں کو اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ (۱)

اسلام کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست قائم فرمائی تو "اراضی مباحہ" کا مذکورہ بالا اصول تو باقی رکھا، کہ غیر آباد غیر مملوک زمینوں میں تمام شہریوں کا حق ہے، لیکن "حمی" بنانے کے مذکورہ طریقے کو ناجائز قرار دیدیا، اور اعلان فرمادیا کہ آئندہ کسی شخص کو بھی اس بات کا حق نہیں ہوگا کہ وہ "ارض مباحہ" کے کسی حصے کو "حمی" بنا کر دوسروں کو اس سے روک دے۔

البتہ ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول میں ایک استثناء کا بھی اعلان فرمایا، اور وہ یہ کہ جب کبھی اسلامی ریاست کو مصالح عامہ کے تحت کسی "ارض مباحہ" کو سرکاری ضرورت کے لئے "حمی بنانے کے لئے ضرورت پیش آئے گی، وہ ایسا کر سکے گی، ایسی صورت میں اس "ارض مباحہ" سے وہی کام لیا جا سکے گا جس کے لئے اسے سرکاری طور پر مخصوص کر لیا گیا

---

(۱) فتح الباری، ص ۴۴ ج ۵۔

ہے، اور دوسروں کو سرکاری اجازت کے بغیر اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہوگا، یہ اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

لا حمی إلا للہ ولرسولہ

"اب کوئی حمی نہیں ہوگی، سوائے اللہ اور اس کے رسول کی حمی کے" (۲)

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کسی بھی شخص کی ذاتی "حمی" کو تسلیم نہیں کیا گیا، لیکن مصالح عامہ اور سرکاری ضرورت کے تحت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "نقیع" نامی علاقے کی زمین کو "حمی" بنایا۔ (۳)

۱۰۰۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد مبارک میں اسی اصول کے تحت شرف اور ربذہ کے مقامات پر ایک "ارض مباحہ" (یعنی غیر آباد غیر مملوک) زمین کو صدقہ کے اونٹوں کی مخصوص چراگاہ قرار دے کر اسے حمی بنایا، اس موقع پر ان بستیوں کے بعض باشندوں نے اعتراض کیا کہ "ارض مباحہ" سے تمام شہریوں کو نفع اٹھانا جائز ہوتا ہے، اور ہم لوگ اس علاقے کے باشندے ہیں، اس علاقے کو دشمن سے محفوظ رکھنے کے لئے ہم نے جنگیں لڑی ہیں، اس لئے خاص طور پر ہمیں اس زمین سے "مباح عام" کے طور پر فائدہ اٹھانے کا حق ضرور پہنچنا چاہئے، اور اسے صرف بیت المال کے مویشیوں کے لئے مخصوص کرنا درست نہیں، لیکن چونکہ حضرت عمرؓ کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اور عمل دونوں موجود تھے، جن کی رو سے ایک اسلامی حکومت کو مصالح عامہ کی خاطر مباح زمین کو "حمی" بنانا جائز ہے، اس لئے بیت المال کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے اس اعتراض کو قبول نہیں فرمایا، اور اس زمین کو بدستور "حمی" بنائے رکھا، البتہ ساتھ ہی "حمی" کے نگران کو یہ تاکید بھی فرمادی کہ غریب لوگ اپنی تھوڑی بہت بکریاں چرانے کے لئے لائیں تو انہیں اجازت دیدیا کرو، مگر دولت مندوں کو آنے سے روکو۔

۱۰۱۔ یہ ہے اصل واقعہ اور اس کا صحیح پس منظر، اب میں صحیح بخاری سے اس واقعے کے الفاظ نقل کرتا ہوں:

«إن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ استعمل مولی لہ یدعی ھنیا علی الحمی.

فقال: یا ھنی اضمم جناحك عن المسلمین، و اتق دعوة المسلمین، فإن

---

(۲) صحیح البخاری، کتاب المساقات، باب نمبر ۱۱، حدیث نمبر ۲۳۷۰، و کتاب الجہاد، باب نمبر ۱۴۶، حدیث نمبر ۳۰۱۲۔

(۳) صحیح البخاری، حدیث نمبر ۲۳۷۰

دعوة المظلوم مستجابة ، أدخل رب الصرية و الغنية ، و إياى و نعم ابن عوف . ونعم ابن عفان ، فإنهما إن تهلك ما شيتها يرجعا إلى نخل وزرع ، و إن رب الصرية ورب الغنيمة إن تهلك ما شيتها يأتني ببنيه . فيقول : يا أمير المومنين! أفتاركهم أنا لا أبالك؟ فالماء و الكلاء أيسر علىّ من الذهب و الورق . و أيم الله أنهم ليرون أنى قد ظلمتهم ، إنها لبلادهم . فقاتلوا عليها في الجاهلية و أسلموا عليها في الإسلام . والذى نفسي بيده . لو لا المال الذى أحمل عليه في سبيل الله ماحميت عليهم من بلادهم شبراً »

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام کو جس کا نام "ھنی" تھا، حمی پر نگران مقرر کیا تھا، چنانچہ اسے (نصیحت کرتے ہوئے) فرمایا کہ اے ہنی! تم مسلمانوں سے نرمی کا معاملہ کرنا، اور مسلمانوں کی دعاؤں سے بچنا۔ کیونکہ مظلوم کی دعا قبول ہوتی ہے، اور چھوٹے موٹے اونٹ بکری والوں کو اندر آنے دیا کرو، لیکن عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور عثمان بن عفانؓ (جیسے دولت مند لوگوں) کے مویشیوں سے مجھے بچاؤ، اس لئے کہ اگر ان کے مویشی ہلاک ہو گئے، تو وہ اپنے نخلستانوں اور کھیتیوں کی طرف لوٹ جائیں گے، (اور اپنے نقصان کی تلافی کر لیں گے۔) لیکن اگر کسی چھوٹے موٹے اونٹ بکری والے کے مویشی ہلاک ہو گئے تو وہ میرے پاس اپنے بیٹوں کو لا کھڑا کرے گا، اور آ کر اے امیر المومنین کہے گا (یعنی اپنے نقصان پر فریاد کرے گا) تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں انہی ویسے ہی چھوڑ دوں گا؟ (نہیں؟ بلکہ مجھے ان کے نقصان کی تلافی کے لئے کچھ نقد رقم دینی پڑے گی) لہٰذا ان کی تھوڑی بہت بکریوں کو پانی اور گھاس مہیا کر دینا زیادہ آسان ہے، بہ نسبت اس کے کہ انہیں سونا چاندی دینا پڑے، خدا کی قسم! یہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ میں نے (حمی بنا کر) ان پر ظلم کیا ہے، یہ ان کا وطن ہے، جس پر انہوں نے جاہلیت میں لڑائیاں کیں، اور اس پر عہد اسلام میں وہ اسلام لائے، قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر یہ مال (مویشی) میرے پاس نہ ہوتے جو میں لوگوں کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے سواری کی خاطر مہیا کرتا ہوں، (اور ان کے لئے مستقل چراگاہ کی ضرورت نہ ہوتی) تو میں ان کے

لئے مستقل چراگاہ کی ضرورت نہ ہوتی) تو میں ان کے وطن سے ایک بالشت زمین کو بھی حمی نہ بناتا" (۱)

۱۰۲۔ مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ جس زمین کو حضرت عمرؓ نے حمی بنایا، وہ کسی کی شخصی ملکیت میں نہیں تھی، بلکہ غیر آباد اور غیر مملوک زمین تھی، جو شریعت کی اصطلاح میں "مباح عام" کہلاتی ہے، اس سے تمام بستی کے لوگ فائدہ اٹھاتے تھے، مگر وہ ملکیت کسی کی نہیں تھی، اور جن بستی والوں سے اس اقدام پر اعتراض کیا، ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہماری مملوک زمین ہم سے کیوں چھین لی گئی؟ بلکہ اعتراض یہ تھا کہ یہ ہمارا وطن ہے، اور اس کی مباح عام اراضی سے فائدہ اٹھانا ہمارا حق ہے، کیونکہ ہم نے اپنے اس وطن کے دفاع کے لئے لڑائیاں لڑی ہیں، اوپر صحیح بخاری کی جو روایت پیش کی گئی ہے، اس میں حضرت عمرؓ نے اس زمین کے بارے میں یہ فرمایا کہ "انها لبلادھم" (یعنی یہ انکا وطن ہے/ان کا ملک ہے/ان کا علاقہ ہے) یہ نہیں فرمایا کہ یہ ان کی مملوک زمین ہے، امام ابو عبیدؒ نے بستی والوں کے ساتھ حضرت عمرؓ کا مکالمہ زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ روایت کیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں:

قال أسلم: فسمعت رجلا. من بني ثعلبة يقول: يا أمير المومنين! حميت بلادنا قاتلنا عليها في الجاهلية وأسلمنا عليها في الإسلام، يرددها عليه مرارا، و عمر واضع رأسه، ثم أنه رفع رأسه إليه. فقال: البلاد بلاد الله و تحمى لنعم مال الله، يحمل عليها في سبيل الله.

اسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے قبیلہ بنو ثعلبہ کے ایک شخص کو سنا کہ وہ حضرت عمرؓ سے یہ کہہ رہا تھا کہ "اے امیر المومنین! آپ نے ہمارے علاقے/ہمارے ملک/ہمارے وطن کو حمی بنا لیا ہے، ہم نے اس علاقے کی خاطر جاہلیت میں لڑائیاں لڑیں، اور عہد اسلام میں اسی علاقے پر مسلمان ہوئے" یہ بات وہ صاحب بار بار کہتے رہے، حضرت عمرؓ نے سر جھکایا ہوا تھا، پھر انہوں نے سر اٹھا کر ان سے فرمایا: وطن/علاقہ/ملک اللہ کا تھا، اور اسے اللہ تعالیٰ کے مال مویشی

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب نمبر ۱۸۰، حدیث نمبر ۳۰۵۹۔

(بیت المال) کے لئے حمی بنایا جا رہا ہے، ان مویشیوں پر اللہ ہی کی راہ میں سواری کی جائے گی" (۱)

ان الفاظ سے یہ بات صاف واضح ہے کہ بنو ثعلبہ کے اس صاحب کا دعوی یہ نہیں تھا کہ وہ زمین ہماری شخصی ملکیت میں تھی، بلکہ ان کی شکایت یہ تھی کہ یہ ہمارے وطن/علاقے/ملک کی مباح زمین تھی، جس سے ہم فائدہ اٹھایا کرتے تھے، اب ہمیں اس سے محروم کر دیا گیا ہے، پھر جواب میں حضرت عمرؓ نے صاف ارشاد فرمایا کہ وہ علاقہ کسی کی ملکیت نہ تھا، بلکہ اللہ ہی کا تھا، (یعنی مباح اور غیر مملوک تھا) اب اسے اللہ تعالیٰ ہی کے مویشیوں کی حفاظت کے لئے مخصوص کر لیا گیا ہے۔

۱۰۳۔ یہ واقعہ حدیث اور تاریخ کی بہت سی کتابوں میں اسی طرح مذکور ہے، جس میں شخصی ملکیت کو حمی بنانے کا دور دور کوئی تصور موجود نہیں ہے، دراصل "حمی" بنانے کی اصطلاح کا مطلب ہی یہ ہے کہ جو اراضی غیر مملوک اور مباح عام ہوں، ان سے عام لوگوں کو فائدہ اٹھانے سے روک کر انہیں کسی کام کے لئے خاص کر لیا جائے۔ امام ابو عبیدؒ تحریر فرماتے ہیں:

«و تاویل الحمی المنھی عنہ فیما نری، واللہ أعلم، أن تحمی الأشیاء التی جعل رسول اللہ ﷺ الناس فیھا شرکاء، وھی الماء و الکلاء و النار»

حمی بنانا جس سے شریعت میں (عام لوگوں کو) منع کیا گیا ہے، اس کا مطلب ہمارے علم کی حد تک یہ ہے کہ ان اشیاء سے لوگوں کو منع کر دیا جائے جس میں تمام لوگ شریک ہیں، اور وہ ہیں: پانی، خود رو گھاس، اور آگ۔ (۱)

لہٰذا حضرت عمرؓ کے حمی بنانے کا مطلب یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ شخصی ملکیت کی اراضی کو چھین کر انہیں بیت المال کی چراگاہ بنایا گیا، بلکہ اصل واقعہ وہی ہے جس کی تفصیل اوپر بیان کی گئی اور ہر وہ شخص جسے اس دور کے نظام اراضی اور "حمی" بنانے کی اصطلاح کا علم ہے، اس کے سوا واقعے کی دوسری کوئی تشریح نہیں کرے گا، چنانچہ حدیث کے شارحین نے اس کی یہی تشریح کی ہے، یہاں میں صرف نمونے کے لئے حافظ ابن حجرؒ کے الفاظ نقل کرتا ہوں، جو صحیح بخاری کے مستند ترین شارح ہیں، اور جن کی حالت یہ ہے کہ پورا ذخیرہ حدیث ہمیشہ کھلی کتاب کی طرح ان کے سامنے رہتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) کتاب الاموال لابی عبید، ص ۲۹۹، فقرہ نمبر ۷۴۰، باب حمی الارض۔

(۱) کتاب الاموال، ص ۲۹۴ فقرہ نمبر ۷۲۷۔

و إنما ساغ لعمر ذلك لأنه كان مواتاً . فحماه لنعم الصدقة لمصلحة عموم المسلمين.

حضرت عمرؓ کے لئے یہ اقدام اس لئے جائز ہوا کہ وہ زمین "موات" (غیر آباد غیر مملوک) تھی. پس حضرت عمرؓ نے اسے عام مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر صدقہ کے مویشیوں کے لئے حمی بنایا۔

آگے اس زمین کے شخصی ملکیت میں ہونے کی صراحۃً تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

و إنما حمى عمر بعض الموات مما فيه نبات من غير معالجة أحد . و خص إبل الصدقة و خيول المجاهدين . و أذن لمن كان مقلاً أن يرعى فيه مواشيه رفقا به . . . . و أما قوله «يرون أني ظلمتم» فأشار به إلى أنهم يدعون أنهم أولى به . لا أنه منعوا حقهم الواجب لهم.

حضرت عمرؓ نے "موات" (غیر آباد غیر مملوک) زمین کا کچھ حصہ حمی بنایا تھا, جس میں کسی کی کوشش کے بغیر (خود رو) گھاس موجود تھی. اس جگہ کو آپ نے صدقے کے اونٹوں اور مجاہدین کے گھوڑوں کے لئے مخصوص کر لیا, اور جو لوگ کم مال والے تھے. ان کو اس میں مویشی چرانے کی از راہ ہمدردی اجازت دیدی, ۰۰۰۰۰ رہا حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد کہ "یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے ان پر ظلم کیا ہے" سو آپ کا اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ اس بستی کے لوگوں کا دعوی یہ ہے کہ (زمین کے قرب کی وجہ سے) وہ اس سے فائدہ اٹھانے کے زیادہ مستحق ہیں. یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس اقدام سے ان کے حق واجب (یعنی ملکیت) سے انہیں محروم کر دیا گیا ہے۔ (۱)

میں سمجھتا ہوں کہ اس وضاحت کے بعد "حمی" کے اس واقعے سے شخصی ملکیت کو بلا معاوضہ سرکاری تحویل میں لینے کا کوئی دور دراز کا بھی تعلق نہیں ہے, لہٰذا فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں جس ایک واقعے کو معاوضے کے بغیر جائیداد لے لینے کا تنہا واقعہ قرار دیا گیا ہے, وہ بھی مسئلہ زیر بحث سے قطعی غیر متعلق ہے, اور اس سے استدلال درست نہیں۔

---

(۱) فتح الباری. ص ۱۷۷ ج ۶. کتاب الجہاد. مطبوعہ لاہور۔

بلال بن حارث ؓ کی جاگیر کا قصہ۔

۱۰۴۔ فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں حضرت بلال بن حارث ؓ کی جاگیر کا قصہ ذکر کیا گیا ہے، اگرچہ ساتھ ہی اس فیصلے میں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اس واقعے کا تعلق شخصی ملکیت کی زمینوں سے نہیں ہے، تاہم چونکہ اس واقعہ سے بعض اوقات زمینوں کو بلامعاوضہ ضبط کرنے پر استدلال کیا جاتا ہے، اس لئے مختصراً اس واقعے پر بھی ایک نظر ڈال لینا مناسب ہو گا۔

۱۰۵۔ یہ واقعہ اگرچہ حدیث اور فقہ کی متعدد کتابوں میں مذکور ہے، لیکن اس کی وہ روایت جس سے جائیداد کی ضبطی پر استدلال کیا جاتا ہے، صرف یحییٰ بن آدم ؒ کی کتاب الخراج میں آئی ہے، اس ؒ کے الفاظ یہ ہیں۔

«عن عبدالله بن أبي بكر قال : جاء بلال ابن الحارث المزني إلى رسول الله ﷺ فاستقطعه أرضا ، فأقطعها له طويلة عريضة ، فلما ولى عمر قال له : يا بلال ! إنك استقطعت رسول الله ﷺ أرضا طويلة عريضة فقطعها لك ، و إن رسول الله ﷺ لم يكن يمنع شيئا يسأله ، وأنت لا تطيق ما في يدك ، فقال : أجل ، فقال : فانظر ما قويت عليه منها فأمسكه ، و مالم تطق و مالم تقو عليه فادفعه إلينا نقسمه بين المسلمين فقال : لا أفعل و الله شيئا ، أقطعنيه رسول الله ﷺ ، فقال عمر : والله لتفعلن ، فأخذ منها ما عجز عن عمارته ، فقسمه بين المسلمين» .

عبداللہ بن ابی بکر کہتے ہیں کہ حضرت بلال بن حارث مزنی ؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے، اور آپ سے ایک قطعہ زمین طلب کیا، آپ نے ان کو ایک لمبی چوڑی زمین جاگیر کے طور پر دے دی، جب حضرت عمر ؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے حضرت بلال بن حارث ؓ سے کہا کہ اے بلال! آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لمبی چوڑی زمین مانگی تھی، جو آپ نے دے دی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی شخص آپ ؐ سے کچھ طلب کرتا تو آپ ؐ اسے روکتے نہیں تھے، لیکن اب جو زمین آپ کے قبضے میں ہے، اس (کو آباد کرنے) کی طاقت آپ میں نہیں ہے، حضرت بلال ؓ نے کہا، ہاں! حضرت عمر ؓ نے

فرمایا: پھر تو آپ جائزہ لے کر دیکھیں، زمین کے جتنے حصے (کو آباد کرنے) کی آپ میں طاقت ہو اسے تو اپنے پاس رکھ لیں، اور جس کی طاقت نہ ہو، وہ ہمیں دیدیں. تاکہ ہم اسے مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیں، انہوں نے کہا: خدا کی قسم میں کچھ نہیں دونگا. یہ زمین مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی، حضرت عمرؓ نے فرمایا: خدا کی قسم تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا، چنانچہ آپ نے حضرت بلالؓ سے اتنی زمین لے لی جسے آباد کرنے سے وہ عاجز تھے، پھر اسے مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا" (۱)

اس واقعہ سے استدلال کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت بلال بن حارثؓ کی وہ زمین جو عطائے نبوی سے ان کی ملکیت میں آچکی تھی، ان سے بلا معاوضہ لے لی، اس سے معلوم ہوا کہ مصالح عامہ کے تحت شخصی املاک کو بلا معاوضہ لیا جا سکتا ہے۔

اس دلیل کے سلسلے میں چند نکات قابل ذکر ہیں:

(۱) یہ واقعہ حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی مذکور ہے، اور اکابر آئمہ حدیث میں سے امام مالکؒ، امام احمدؒ، امام ابوداؤدؒ، امام حاکمؒ وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے، لیکن انہوں نے صرف اتنا ذکر فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال بن حارثؓ کو ایک زمین بطور جاگیر عطا فرمائی تھی، لیکن ان میں سے کسی نے حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس جاگیر یا اس کے کچھ حصے کی واپسی کا ذکر نہیں فرمایا، واپسی کی جو تفصیل اوپر بیان ہوئی، وہ صرف یحییٰ بن آدمؒ نے روایت کی ہے، لیکن یہ روایت بھی اس لحاظ سے محل نظر ہے کہ اس کے راوی عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن خرم خود واقعے کے وقت موجود نہیں تھے، کیونکہ ان کی وفات ۱۳۵ھ میں ستر سال کی عمر میں ہوئی (تہذیب التہذیب) جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ۶۵ھ میں پیدا ہوئے تھے، جب کہ بلال بن حارثؓ کا انتقال ۶۰ھ میں ہو چکا تھا، (۱) لہٰذا یہ روایت محدثین کی اصطلاح کے مطابق "منقطع" ہے، جو زیادہ قابل اعتماد نہیں ہوتی۔

(۲) اگر یہ واقعہ درست ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے جاگیر کا کچھ حصہ لے لیا تھا تو اسی یحییٰ بن آدمؒ والی روایت میں صراحت موجود ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت بلالؓ سے صرف اتنی زمین لی تھی جسے وہ آباد کرنے سے عاجز تھے، اور شرعی قاعدہ یہی ہے کہ جس کسی شخص کو بنجر زمین

---

(۱) کتاب الخراج یحییٰ بن آدمؒ، ص ۹۳، حدیث نمبر ۲۹۴، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۴۷ھ بتحقیق احمد شاکر۔

(۱) الاصابہ، ص ۱۶۸ ج ۱۔

بطور جاگیر دی گئی ہو، اگر وہ تین سال تک اسے آباد نہ کر سکے تو حکومت کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ زمین اس سے واپس لے لے۔ حضرت عمرؓ نے اسی قاعدہ کے مطابق صرف اتنی زمین ان سے واپس لی جسے نہ صرف یہ کہ وہ آباد نہ کر سکے تھے، بلکہ اسے آباد کرنے سے عاجز تھے۔

یہ بات کہ تحجیر زمین کا جاگیردار اگر تین سال تک زمین کو آباد کر سکے تو اس کے بعد اس زمین پر اس کا حق ختم ہو جاتا ہے، متعدد احادیث و آثار سے ثابت ہے۔ حضرت طاؤس مرسلا روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«عادی الأرض لله و للرسول ۔ ثم لكم من بعد ۔ فمن أحيا أرضا ميتة فهي له ۔ و ليس لمحتجر حق بعد ثلاث سنين».

لاوارث زمین اللہ اور رسول کی ہے، پھر بعد میں تمہاری ہے، پس جو شخص کسی مردہ (غیر آباد غیر مملوک) زمین کو آباد کرے تو وہ زمین اسی کی ہے، اور کسی ایسے شخص کا جس نے (کسی مردہ زمین کو گھیرنے کے لئے) پتھر لگائے ہوں، تین سال کے بعد کوئی حق نہیں۔ (۱)

یہی الفاظ حضرت عمرؓ کے اپنے قول کے طور پر بھی مروی ہیں، انہوں نے فرمایا:

«ليس لمحتجر حق بعد ثلاث سنين»

پتھر لگانے والے کو تین سال کے بعد کوئی حق نہیں۔ (۲)

انہی احادیث کی بنا پر فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ جس شخص کو کوئی زمین آباد کرنے کے لئے دی گئی ہو، اگر وہ تین سال تک اسے آباد نہ کرے تو وہ اس سے واپس لے لی جائے گی۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

«ومن حجر أرضا ولم يعمر ثلاث سنين أخذها الإمام و دفعها إلى غيره ۔ لأن الدفع إلى الأول كان ليعمرها فتحصل المنفعة للمسلمين من حيث العشر و الخراج ۔ فإذا لم يحصل يدفعه إلى غيره تحصيلا للمقصود ۔ ولأن التحجير ليس بإحياء ليملكه به ۔ لأن الإحياء إنما هو العمارة ۔

(۱) کتاب الخراج لابی یوسف، ص ۶۵، فصل فی موات الارض۔

(۲) کتاب الخراج، بحوالہ بالا، و نصب الرایہ للزیلعی، ص ۲۹۰ و ۲۹۱ ج ۴۔

والتحجير للإعلام، سمی به لأنهم كانوا يعلمونه بوضع الأحجار حوله.
أو يعلمونه لحجر غيرهم عن إحياءه. فبقي غير مملوك كما كان»

اور جو شخص کسی زمین کی تحجیر کرے (یعنی اس میں پتھر لگائے) اور تین سال تک اسے آباد نہ کرے، تو امام (حکومت) اسے واپس لے کر دوسرے کو دے دیگی، اس لئے کہ پہلے شخص کو جو زمین دی گئی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسے آباد کرے، اور عشر و خراج کے ذریعہ اس کا فائدہ عام مسلمانوں کو بھی پہنچے، جب یہ فائدہ حاصل نہ ہوا تو امام وہ زمین دوسرے کو دے دیگا، تاکہ مقصد حاصل ہو سکے، دوسرے "تحجیر" بذات خود مردہ زمین کو زندہ کرنے کے مرادف نہیں ہے، کہ اس کے ذریعہ ملکیت حاصل ہو سکے، اس لئے زندہ کرنا تو اسی وقت صادق آئے گا جب زمین کو واقعتہً آباد کیا جائے، اور تحجیر تو صرف علامت لگانے کے لئے ہوتی ہے، اور اس کا نام "تحجیر" اس لئے رکھا گیا ہے کہ عام طور سے لوگ زمین (کو گھیرنے کے لئے) اس پر پتھر رکھ کر علامت لگا دیتے تھے، یا کوئی اور علامت رکھ دیتے تھے، تاکہ اس کے ذریعہ دوسروں کو زمین کے زندہ کرنے سے روکا جائے، لہٰذا یہ زمین (تحجیر کے بعد) اسی طرح غیر مملوک رہی جیسی وہ پہلے تھی۔ (۱)

اس اصول کے تحت حضرت بلال بن حارثؓ نے اس زمین کو آباد نہیں کیا تھا، اس لئے ابھی تک وہ ان کی ملکیت میں نہیں آئی تھی، اور تین سال گزرنے پر انکا آباد کاری کا حق بھی ختم ہو گیا تھا، اگر حضرت عمرؓ اسے کسی نوٹس کے بغیر بھی واپس لے لیتے تو وہ مذکورہ بالا قاعدہ کے مطابق ہوتا، لیکن انہوں نے حضرت بلال بن حارثؓ کو بلا کر انہیں اور موقع دیا، کہ اگر اب بھی وہ اسے آباد کرنے کا وعدہ کریں تو زمین ان سے واپس نہ لی جائے، لیکن انہوں نے یہ یقین دھانی بھی نہ کرائی، اس موقع پر جتنی زمین کو آباد کرنے سے وہ عاجز تھے، اتنی زمین واپس لے لی گئی، یہی واقعہ امام ابو عبیدؒ نے زیادہ بہتر سند کے ساتھ روایت کیا ہے، اس میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت بلالؓ سے فرمایا:

إن رسول الله ﷺ لم يقطعك لتحتجره عن الناس، إنما أقطعك لتعمل فخذ منها ما قدرت على عمارته، ورد الباقي.

---

(۱) ہدایہ۔ ص ۷۷ ۴ ج ۴۔ مطبوعہ مطبع یوسفی، لکھنؤ۔ انڈیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قطعہ زمین آپ کو اس لئے نہیں دیا تھا کہ آپ
صرف اس کی تحجیر کر کے لوگوں کو اسے آباد کرنے سے روک دیں، حضور نے
تو وہ زمین آپ کو اس لئے دی تھی کہ آپ اس میں کام کریں. لہٰذا جتنے حصے کی آباد
کاری پر آپ کو قدرت ہو. وہ تو آپ لے لیں. لیکن باقی واپس کر دیں۔ (۱)

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جو زمین حضرت عمرؓ نے حضرت بلال بن حارثؓ سے واپس لی وہ چونکہ انہوں نے آباد نہیں کی تھی. اس لئے ان کی ملکیت نہیں تھی. انہیں اس کی آباد کاری کا حق ضرور تھا. لیکن یہ حق بھی نہ صرف یہ کہ تین سال گزرنے پر ختم ہو گیا تھا. بلکہ وہ آئندہ بھی اسے آباد کرنے پر آمادہ نہیں تھے. لہٰذا اس زمین کو واپس لینے سے کسی ایسی زمین کی ضبطی کا کوئی جواز ثابت نہیں ہوتا جو مالک کی شخصی ملکیت میں ہو. یہی وجہ ہے کہ جو زمین حضرت بلال بن حارثؓ آباد کر چکے تھے. اور آباد کاری کی بنا پر ان کی ملکیت میں آ چکی تھی. حضرت عمرؓ نے اس کو واپس لینے کے لئے ایک حرف بھی نہیں فرمایا. وہ زمین بدستور انہیں کی ملکیت میں رہی. ان سے ان کی اولاد کی طرف منتقل ہو گئی. بالآخر ان کی اولاد نے خود وہ زمین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو فروخت کی. اور اس دوران اس زمین میں کچھ کانیں بھی نکل آئیں. جو انہیں کے استعمال میں رہیں. اور وہ ان کی زکوٰۃ ادا کرتے رہے۔ (۲)

عراق کی زمینوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ

۱۰۵۔ فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں جب عراق فتح ہوا تو بعض حضرات کی رائے یہ تھی کہ مفتوحہ اراضی کے بارے میں اب تک جو معمول رہا ہے اس پر اب بھی عمل کیا جائے. یعنی یہ اراضی فاتح لشکر کے مجاہدین کے درمیان مالکانہ حقوق کے ساتھ تقسیم کر دی جائیں. لیکن حضرت عمرؓ نے اس موقع پر بڑے وثوق کے ساتھ یہ موقف اختیار فرمایا کہ اگر ساری زمینیں اسی طرح مجاہدین کے درمیان تقسیم کی جاتی رہیں تو آنے والوں کے لئے کچھ بھی نہ بچے گا. اس لئے انہوں نے صحابہ کرام کے مشورے سے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ اراضی تقسیم نہ کی جائیں. بلکہ سابق مالکوں کی تحویل میں باقی رکھی جائیں. البتہ ان پر سالانہ خراج عائد کر دیا جائے۔

---

(۱) کتاب الاموال لابی عبید. ص ۲۹۰ فقرہ ۷۱۲۔

(۲) کتاب الاموال لابی عبید۔ ص ۳۳۸ و ۳۳۹. فقرہ نمبر ۸۶۳ تا ۸۶۶۔

۱۰۶۔ حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کی تشریح وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں یہ کی گئی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان زمینوں کو قومی ملکیت میں لے لیا. اور اس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ امت کی مصلحت کے خاطر زمینوں کو نیشنلائز کرنا جائز ہے۔

۱۰۷۔ یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر بالفرض حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کی وہی تشریح اختیار کی جائے جو وفاقی شرعی عدالت نے کی ہے. یعنی یہ کہ فاروق اعظمؓ نے عراق کی زمینوں کو نیشنلائز کر لیا تھا. تب بھی یہ واقعہ ہمارے زیر بحث مسئلے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا. کیونکہ ہمارا زیر بحث مسئلہ ہر قسم کے نیشنلائزیشن کا جواز و عدم جواز نہیں ہے. بلکہ اس کی ایک خاص صورت ہے. اور وہ یہ کہ جو لوگ کسی زمین کے بجا طور پر مالک بن چکے ہوں. اور اپنے اوپر عائد ہونے والے شرعی واجبات بھی ادا کرتے ہوں. کیا ان سے بلا معاوضہ زمینیں لی جا سکتی ہیں؟

۱۰۸۔ اس کے برعکس عراق کی زمینوں کا جو واقعہ پیش آیا، وہ یہ تھا کہ جب مسلمانوں نے عراق فتح کر لیا تو ابھی وہاں کی زمینیں کسی کی شخص ملکیت میں آئی ہی نہیں تھیں. وہ مفتوحہ زمینیں تھیں. ان کے بارے میں اسلامی حکومت کو مکمل اختیار تھا کہ ان کے بندوبست کے لئے جو فیصلہ ملت کے مصالح کے لحاظ سے مناسب سمجھے. کرلے. چاہے مسلمانوں میں مالکانہ حقوق کے ساتھ تقسیم کر دے. چاہے تو انہیں (بعض فقہاء کے قول کے مطابق) مسلمانوں پر وقف کر دے. وہاں اس بات کا کوئی سوال نہیں تھا کہ کسی مسلمان کی جائز ملکیت کے قائم رہتے ہوئے اس سے بلا معاوضہ زمین لے لی جائے۔

۱۰۹۔ نیشنلائزیشن اس صورت میں ناجائز ہے جب اس کے لئے جائز مالکوں کو کسی معاوضے کے بغیر ان کی ملکیت سے محروم کرنا پڑے. یا اس کے شرعی مستحقین کا حق تلف کر کے یہ اقدام کیا جائے. لیکن اگر کوئی زمین کسی کی ملکیت نہیں ہے. اور اسے آباد کر کے کوئی اسلامی حکومت نیشنلائزیشن کر لیتی ہے. تو اس میں شرعی نقطہ نظر سے کوئی قباحت نہیں. بلکہ اسلامی فقہ میں ایسی اراضی کو "اراضی سلطانیہ" کہا گیا ہے ــــ حضرت عمرؓ نے اگر عراق کی زمینوں کو وقف کیا تھا (جیسا کہ وفاقی شرعی عدالت یا بعض علماء کا خیال ہے) تو وہ کسی کی جائز ملکیت کو ختم کر کے وقف نہیں فرمایا تھا. اس لئے ہمارے زیر بحث مسئلے سے اس واقعے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۱۰۔ جہاں تک کسی کی جائز ملکیت کو ختم کر کے اسے وقف کرنے یا نیشنلائزیشن کا تعلق ہے. اس کے بارے میں خود حضرت فاروق اعظمؓ نے عراق کی زمینوں ہی کے بارے میں کرتے ہوئے واضح طور پر یہ بیان فرمایا تھا کہ یہ صورت جائز نہیں ہے. چنانچہ آپ نے فرمایا:

«وإني أعوذ بالله أن أركب ظلماً . لئن كنت ظلمتهم شيئا هو لهم . وأعطيته غيرهم لقد شقيت»

اور میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ کسی ظلم کا ارتکاب کروں. اگر میں نے ظلماً ان سے کوئی چیز لی ہوتی جو ان کی ملکیت ہوتی. اور وہ کسی اور کو دیدی ہوتی تو میں شقاوت کا مرتکب ہوتا۔ (۱)

اس سے صاف واضح ہے کہ حضرت عمرؓ نے نہ کسی کی ملکیت چھین کر کسی اور کو دی تھی. اور نہ وہ اسے جائز سمجھتے تھے. بلکہ انہوں نے مفتوحہ اراضی کو سابق مالکان کی تحویل میں رکھتے ہوئے ان پر سالانہ خراج عائد کر دیا تھا. تاکہ اس خراج کی آمدنی آئندہ ہر دور کے مسلمانوں کے کام آتی رہے۔

بلکہ انہی عراق کی زمینوں کا کچھ حصہ مذکورہ فیصلے سے پہلے آپ نے بعض مجاہدین میں تقسیم کر دیا تھا. اور وہ اس کے مالک بن گئے تھے. بعد میں جب آپ کی یہ رائے ہوئی کہ ان زمینوں کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے جو عراق کی عام زمینوں کے ساتھ کیا گیا ہے تو آپ نے ان لوگوں کو راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ یہ زمینیں واپس لیں. اور ان کو بھی عراق کی دوسری زمینوں کے ساتھ شامل فرما دیا۔

چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ البجلی (جو عراق کی فتوحات میں شریک تھے.) فرماتے ہیں:

«كانت بجيلة ربع الناس ، فقسم لهم ربع السواد ، فاستغلوا ثلاثاً أو أربع سنين . أنا شككت ، ثم قدمت على عمر بن الخطاب رضي الله عنه ، ومعي فلانة بن فلان . امرأة منهم قد سماها لا يحضرني ذكر اسمها ، فقال عمر ابن الخطاب رضي الله عنه : لو لا أني قاسم مسئول لتركتم على ما قسم لكم . ولكن أرى أن تردوا على الناس .... و عاضني من حقي فيه نيفا و ثمانين ، وقالت فلانة : شهد أبي القادسية و ثبت سنهمه ، ولا أسلمه حتى تعطيني . كذا كذا ، فأعطاه اياه»

بجیلہ کا قبیلہ عراق کا فاتح لشکر کا ایک چوتھائی حصہ تھا. حضرت عمرؓ نے سواد

---

(۱) کتاب الخراج لابی یوسف. ص۲۵. یہ پوری عبارت آگے بھی آ رہی ہے۔

(عراق) کی چوتھائی زمینیں اس قبیلے میں تقسیم کر دی تھی، چنانچہ یہ لوگ تین چار سال تک اس سے آمدنی حاصل کرتے رہے۔ (راوی کہتے ہیں کہ مدت کے بارے میں مجھے شک ہے کہ وہ تین سال تھی یا چار سال تھی) پھر میں حضرت عمرؓ کے پاس حاضر ہوا۔ میرے ساتھ قبیلۂ بجیلہ کی ایک خاتون اور بھی تھیں۔ (راوی کہتے ہیں ان کا نام حضرت جریرؓ نے بتایا تھا۔ لیکن مجھے اب یاد نہیں) حضرت عمر نے ہم سے فرمایا کہ: "اگر میں ایسا تقسیم کرنے والا نہ ہوتا جسے اپنی ذمہ داری کا بھی احساس ہے تو میں تم لوگوں کو سابقہ تقسیم ہی پر چھوڑ دیتا۔ لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ تم لوگ اپنی زمینیں لوگوں پر لوٹا دو ۰۰۰۰۰ حضرت عمرؓ نے اس کے بعد مجھے میرے حصے کی زمین کے معاوضے میں اسی سے زیادہ دینار عطا فرمائے۔ اور وہ خاتون جو میرے ساتھ آئی تھیں، انہوں نے کہا کہ: میرے والد قادسیہ کی جنگ میں شامل تھے۔ اور ان کا حصہ تقسیم ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں اپنی یہ زمین اس وقت تک آپ کے حوالے نہیں کروں گی جب تک آپ مجھے اتنا اتنا معاوضہ نہ دیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسے مطلوبہ معاوضہ دے دیا۔ (۱)

ایک دوسری روایت میں ان خاتون کا نام ام کرز مذکور ہے۔ اور اس میں یہ تفصیل ہے کہ انہوں نے معاوضے میں ایک اونٹنی، ایک چادر، اور دونوں ہاتھ بھر کر سونا طلب کیا تھا۔ اور حضرت عمرؓ نے ان کو وہی معاوضہ دے دیا۔ (۲)

حضرت عمرؓ کے اس فعل کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن رجب حنبلیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"أنا نسلم أن جريرا و قومه من بجيله قسم لهم عمر رضي الله عنه ربع السواد لكونهم ربع المقاتلة. فإن الإمام يجوز له أن يقسم الأرض بين الغانمين و أن لا يقسم. كما سبق تقريره. فلما قسم لهم عمر رضي الله عنه ذالك ملكوه بالقسمة. ثم رأى عمر رضي الله عنه أن ترك السواد كله فيأ أصلح للمسلمين فاحتاج إلى استرضاءهم و تعويض من لم يرض بترك حقه مما ملكه بغير عوض".

---

(۱) السنن الکبریٰ للبیہقی۔ ص ۱۳۵ ج ۹۔ و کتاب الام للشافعی۔ ص ۱۵۷ ج ۲۔

(۲) سنن بیہقی۔ حوالہ بالا۔ و کتاب الاموال لابی عبید۔ ص ۶۱ و ۶۲ فقرہ نمبر ۱۵۵۔

"ہم تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت جریر اور ان کی قوم کو جو قبیلہ بجیلہ سے تعلق رکھتی تھی، حضرت عمرؓ سے سواد (عراق) کی چوتھائی زمینیں تقسیم کر دی تھیں، کیونکہ بجیلہ کے لوگ مجاہدین کا ایک چوتھائی حصہ تھے. کیونکہ جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، امام کے لئے دونوں صورتیں جائز ہوتی ہیں، چاہے وہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دے. اور چاہے تو تقسیم نہ کرے. لہٰذا جب حضرت عمرؓ نے (چوتھائی) زمینیں انہیں (یعنی قبیلہ بجیلہ کو) تقسیم کر دیں تو اس تقسیم کی وجہ سے وہ ان زمینوں کے مالک بن گئے. بعد میں حضرت عمرؓ کی یہ رائے ہوئی کہ اگر سواد (عراق) کی تمام زمینوں کو فیئی بنا دیا جائے تو یہ مسلمانوں کی مصلحت کے زیادہ مطابق ہو گا. اسی لئے حضرت عمرؓ کو یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ بجیلہ کے لوگوں کو راضی کریں۔ یا ان لوگوں کو معاوضہ ادا کریں جو اپنے اس حق کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوں جو انہیں بلا معاوضہ ملا تھا"

اس تفصیل سے یہ بات کسی شک و شبہ کے بغیر ناقابل انکار طریقے پر ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے عراق کی زمینوں کا جو انتظام فرمایا، اس سے نہ صرف یہ کہ بلا معاوضہ مالکان اراضی سے زمینیں چھین لینے پر کسی طرح استدلال نہیں ہو سکتا، بلکہ اسی واقعے میں حضرت جریر بن عبداللہؓ اور ان کے قبیلے کے دوسرے افراد سے حضرت عمرؓ نے جو معاملہ فرمایا. وہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مصالح عامہ کے تحت بھی جائز مالکوں سے زبردستی زمینیں چھیننا جائز نہیں ہے، یہاں حضرت عمرؓ امت کے مجموعی مصالح کے پیش نظر یہ ضروری سمجھ رہے تھے کہ یہ زمینیں جو بعض مجاہدین کو مالکانہ حقوق کے ساتھ دے دی گئی ہیں، ان سے واپس لی جائیں. لیکن انہوں نے اس غرض کے لئے ان مالکوں سے زبردستی زمینیں نہیں لیں، بلکہ انہیں راضی کر کے معاوضہ ادا فرمایا. حافظ ابن رجب نے مذکورہ بالا اقتباس میں اس نکتے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ زمینیں وہ تھیں جو ان مالکوں نے قیمت ادا کر کے نہیں خریدی تھیں، بلکہ خود حضرت عمرؓ ہی نے بحیثیت سربراہ حکومت ان کو مال غنیمت کے حصے کے طور پر عطا فرمائی تھیں. اس کے باوجود جب وہ بلامعاوضہ یہ زمینیں واپس دینے پر راضی نہیں ہوئے، تو انہیں معاوضہ ادا فرما کر راضی کیا، کیونکہ وہ ان زمینوں کے مالک بن چکے تھے، اگر زمینوں کو بلامعاوضہ لینا حکومت کے لئے جائز ہوتا تو ان زمینوں کو سب سے پہلے زبردستی لیا جاتا، کیونکہ انہیں حاصل کرنے کے لئے مالکوں کو کوئی قیمت ادا کرنی نہیں پڑی تھی، جب ان زمینوں کو واپس لینے کے لئے بھی معاوضہ ادا کرنا ضروری سمجھا گیا تو جو اراضی ان کے مالکوں نے قیمتاً خریدی ہوں، یا خود آباد کی ہوں، ان کو بلا معاوضہ لے لینا کسی طرح

جائز ہو سکتا ہے؟

۱۱۱۔ اگرچہ فاضل وفاقی شرعی عدالت کی دلیل کے جواب میں مذکورہ بالا تشریح بالکل کافی ہے، اور اس سلسلے میں اس واقعے کی مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن چونکہ وفاقی شرعی عدالت نے جس طرح اس واقعے کو ذکر کیا ہے، اس سے کچھ دوسری غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں، اس لئے یہاں مختصراً اس واقعے کی پوری تفصیل ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔

۱۱۲۔ حضرت عمرؓ نے عراق کی اراضی کا جو انتظام فرمایا اس کو وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں "نیشنلائزیشن" سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے اس عمل کی یہ تشریح درست نہیں ہے۔

۱۱۳۔ اس واقعے کی یکجا طور پر مکمل تفصیل سب سے زیادہ جامعیت کے ساتھ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں بیان کی ہے، میں پہلے ذیل میں اس روایت کا مکمل ترجمہ نقل کرتا ہوں۔ (۱)

"اللہ تعالیٰ نے عراق اور شام کی جو زمینیں مال غنیمت کے طور پر مسلمانوں کو عطا

---

(۱) اصل عربی متن یہ ہے:

وشاورهم في قسمة الأرضين التي أفاء الله على المسلمين من أرض العراق والشام. فتكلم قوم فيها، وأرادوا أن يقسم لهم حقوقهم وما فتحوا. فقال عمر رضي الله عنه: فكيف بمن يأتي من المسلمين فيجدون الأرض بعلوجها قد اقتسمت وورثت عن آباء وحيزت. ما هذا برأي. فقال له عبدالرحمن بن عوف: فما الرأي؟ ما الأرض والعلوج إلا مما أفاء الله عليهم. فقال عمر: ما هو إلا كما تقول، ولست أرى ذلك. والله لا يفتح بعدي بلد فيكون فيه أكبر نيل، بل عسى أن يكون كلا على المسلمين. فإذا قسمت أرض العراق بعلوجها، وأرض الشام بعلوجها، فما يسد به الثغور؟ وما يكون للذرية والأرامل بهذا البلد وبغيره من أرض الشام والعراق؟ فأكثروا على عمر رضي الله عنه وقالوا: أتقف ما أفاء الله علينا

فرمائی تھیں. ان کے بارے میں حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ ان کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے؟ بعض حضرات نے گفتگو کے دوران یہ رائے ظاہر کی کہ جن مسلمانوں نے وہ زمینیں فتح کی ہیں، وہ ان کے حق کے طور پر انہی میں تقسیم کر دی جائیں، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: "جو مسلمان آئندہ آئیں گے (یعنی بعد میں پیدا ہوں گے) ان کا کیا ہو گا؟ وہ دیکھیں گے کہ تمام زمینیں اپنے مالکوں سمیت تقسیم ہو چکی ہیں. اور باپ دادوں سے میراث میں بٹتی آ رہی ہیں. اور لوگوں کے قبضے میں ہیں. یہ رائے تو مناسب نہیں معلوم ہوتی". حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا: "پھر آپ کی کیا رائے ہے؟ یہ زمینیں اور ان کے باشندے سب مال غنیمت ہی کا حصہ تو ہیں" (لہٰذا مال غنیمت کے عام قاعدے کے مطابق ہی ان کی تقسیم ہونی چاہئے) حضرت عمرؓ نے جواب دیا: "بات تو آپ کی صحیح ہے. (کہ یہ زمینیں مال غنیمت کا حصہ ہیں) لیکن میری رائے یہ نہیں ہے کہ انہیں مجاہدین میں تقسیم کیا جائے کیونکہ بخدا میرے بعد کوئی ایسا شہر فتح نہیں ہو گا

بأسيافنا على قوم لم يحضروا ولم يشهدوا، ولأبناء القوم وأبناء ابناءهم ولم يحضروا؟ فكان عمر لا يزيد على أن يقول: هذا رأي. قالو: فاستشر. قال: فاستشار المهاجرين الأولين. فاختلفوا. فأما عبدالرحمن بن عوف فكان رأيه أن تقسم لهم حقوقهم. ورأى عثمان وعلي وطلحة وابن عمر رضي الله عنهم رأي عمر. فأرسل إلى عشرة من الأنصار: خمسة من الأوس وخمسة من الخزرج. من كبراءهم وأشرافهم. فلما اجتمعوا حمد الله وأثنى عليه بما هو أهله. ثم قال: إني لم أزعجكم إلا لأن تشتركوا في أمانتي فيما حملت من أموركم. فإني واحد كأحدكم. وأنتم اليوم تقرون بالحق. خالفني من خالفني. ووافقني من وافقني. ولست أريد أن تتبعوا هذا الذي هواي. معكم من الله كتاب ينطق بالحق. فوالله لئن كنت نطقت بأمر أريده ما أريده به إلا الحق. قالوا: قل نسمع يا أمير المؤمنين! قال:

جس سے کچھ زیادہ مال و جائیداد حاصل ہو، بلکہ بعید نہیں ہے کہ وہ نیا شہر مسلمانوں پر بوجھ ہی بنا رہے۔ اب اگر میں عراق اور شام کی زمینیں ان کے زمینداروں سمیت تقسیم کر دیں تو سرحدوں کی حفاظت کے لئے رقم کہاں سے آئے گی؟ شام اور عراق کے علاقوں میں جو یتیم اور بیوائیں موجود ہیں ان کی دیکھ بھال کیسے ہو گی؟"

بعض حاضرین نے حضرت عمرؓ کی اس رائے پر تنقید کی۔ اور کہا کہ: "کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری تلواروں کے ذریعہ جو مال غنیمت عطا فرمایا ہے وہ ایسے لوگوں کے لئے روک رکھیں جو اس معرکے میں نہ حاضر تھے۔ نہ موجود۔ اور

قد سمعتكم كلام هؤلاء القوم الذين زعموا أني أظلمهم حقوقهم ، وإني أعوذ بالله أن أركب ظلما ، لئن كنت ظلمتهم شيئا هو لهم ، وأعطيته غيرهم لقد شقيت ، ولكن رأيت أنه لم يبق شيئي يفتح بعد أرض كسرى ، وقد غنمنا الله أموالهم وأرضهم وعلوجهم ، فقسمت ما غنموا من أموال بين اهله وأخرجت الخمس فوجهته على وجهه وأنا في توجيهه ، وقد رأيت أن أحبس الأرضين بعلوجها وأضع عليهم فيها الخراج وفي رقابهم الجزية يؤدونها فتكون فيئاً للمسلمين المقاتلة والذرية ولمن يأتي بعدهم. أرأيتم هذه الثغور لا بد لها من رجال يلزمونها ، أرأيتم هذه المدن العظام كالشام والجزيرة والكوفة والبصرة ومصر ، لا بد لها من أن تشحن بالجيوش ، ولإدرار العطاء عليهم ، فمن أين يعطى هؤلاء إذا قسمت الأرضون والعلوج؟ فقالوا جميعا : الرأى رأيك ، فنعم ما قلت وما رأيت ، إن لم تشحن هذه الثغور وهذه المدن بالرجال وتجرى عليهم ما يتقوون به رجع أهل الكفر إلى مدنهم . فقال : قد بان لي الأمر ، فمن رجل له جزالة وعقل يضع الأرض مواضعها ، ويضع على العلوج ما يحتملون؟ فاجمعوا له على

ایسے لوگوں کی اولاد اور اولاد کی اولاد کے لئے روک رکھیں جو جنگ میں شامل نہیں تھے؟" اس کے جواب میں حضرت عمرؓ یہی فرماتے کہ "یہ ایک رائے ہے" لوگوں نے کہا "مزید مشورہ کر لیجئے"۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے مہاجرین اولین سے مشورہ فرمایا. ان کی رائیں بھی مختلف تھیں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی رائے یہی تھی کہ مجاہدین کے حقوق انہی میں تقسیم کر دیئے جائیں. لیکن حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، اور عبداللہ بن عمرؓ کی رائے حضرت عمرؓ کے موافق تھی. اب حضرت عمرؓ نے دس انصاری صحابہ کو بلوایا. جن میں سے پانچ قبیلہ اوس کے اور پانچ قبیلہ خزرج کے سردار اور معززین تھے. جب یہ حضرات جمع ہوئے تو حضرت عمرؓ نے حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

میں نے آپ حضرات کو صرف اس لئے زحمت دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ لوگوں کے معاملات کی جس امانت کا بوجھ مجھ پر ڈالا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس میں آپ بھی شریک ہوں. اس لئے کہ میں آپ لوگوں جیسا ہی ایک شخص ہوں. لہٰذا آپ حق بات کا برملا اظہار کریں. جو چاہے میری رائے کے خلاف رائے دے. اور جو چاہے میری موافقت کرے. میں یہ نہیں چاہتا کہ جو کچھ میری خواہش ہے آپ اس میں ضرور میری اتباع کریں. آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کتاب موجود ہے. جو حق بات ہی کہتی ہے. خدا کی قسم اگر میں اپنے کسی ارادے کا اظہار کروں گا. تو اس کا مقصد بھی حق تک پہنچنا ہی ہو گا. اس پر ان حضرات نے فرمایا: "امیر المومنین! آپ فرمایئے. ہم توجہ سے سنیں گے"

اب حضرت عمرؓ نے فرمایا: آپ نے ان لوگوں کی باتیں سنی ہوں گی جن کا خیال یہ ہے کہ میں (عراق اور شام کی زمینیں لوگوں میں تقسیم نہ کر کے) ان کے حقوق پر ظلم کر رہا ہوں. واقعہ یہ ہے کہ میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ

عثمان بن حنيف، وقالوا: تبعثه إلى أمر ذلك. فإن له بصراً و عقلاً و تجربةً. فأسرع إليه عمر فولاه مساحة أرض السواد. فأدت جباية سواد الكوفة قبل أن يموت عمر رضي الله عنه بعام مائة ألف درهم».

کسی ظلم کا ارتکاب کروں. اگر میں نے ان لوگوں سے کوئی ایسی چیز ظلماً لی ہوتی جو ان کی ملکیت ہوتی. اور وہ میں ان سے چھین کر کسی اور کو دے دیتا تو یقیناً میں شقاوت کا مرتکب ہوتا. لیکن میں نے یہ سوچا ہے کہ کسریٰ کی سر زمین کے بعد کوئی ایسی اہم سرزمین باقی نہیں رہی جو آئندہ فتح ہو. اللہ تعالیٰ نے آج ہمیں کسریٰ کا مال و دولت. اس کی زمینیں اور اس کے لوگ مال غنیمت کے طور پر عطا فرما دیئے ہیں. جہاں تک مال و دولت کا تعلق ہے. جتنا مال غنیمت میں حاصل ہوا تھا. وہ میں نے اس کے مستحقین (یعنی مجاہدین) کے درمیان تقسیم کر دیا. اور اس کا پانچواں حصہ نکال کر بیت المال میں داخل کر دیا. اسے قاعدہ کے مطابق صرف کر دیا ہے. اور کچھ کرنے میں لگا ہوا ہوں. لیکن زمینوں کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ انہیں میں ان کے مالکوں کے ساتھ روک رکھوں. اور ان لوگوں کے ذمے ان زمینوں کا خراج عائد کر دوں. اور ان کی جانوں کے تحفظ کے لئے ان پر جزیہ عائد کروں. یہ لوگ جزیہ اور خراج ادا کرتے رہیں. اور یہ رقم مسلمانوں کے لئے فیئی (کفار سے حاصل شدہ مال جو رفاہ عام کے کاموں میں خرچ ہوتا ہے) بن جائے. اس مال سے مجاہدین بھی فائدہ اٹھائیں. ان کی اولاد بھی. اور آئندہ آنے والے مسلمان بھی۔

ذرا دیکھئے تو سہی ہماری ان سرحدوں کے لئے ایسے آدمی چاہییں جو ہمیشہ سرحدوں پر مقیم رہیں. اور ذرا ان بڑے بڑے شہروں، شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر کو دیکھئے ان شہروں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ انہیں فوج سے بھر دیا جائے. اور ان کو مسلسل تنخواہیں دی جائیں. اگر تمام زمینیں اور ان کے باشندے (غلاموں کے طور پر) تقسیم کر دیئے گئے تو اس فوج کو تنخواہیں کہاں سے دی جائیں گی؟

حضرت عمرؓ کی اس تشریح کے جواب میں سب نے اتفاق رائے سے کہا کہ آپ کی رائے صائب ہے. آپ نے اچھی بات سوچی ہے، اگر ان سرحدوں اور شہروں کو آدمیوں سے نہ بھر دیا گیا اور ان کی ایسی تنخواہیں جاری نہ کی گئیں جن سے انہیں قوت حاصل ہو تو کافر لوگ اپنے شہروں کو لوٹ جائیں گے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: بات واضح ہو گئی ہے. اب کون ایسا شخص ہے جو عقل اور تجربہ رکھتا ہو. زمینوں کا صحیح انتظام کرے. اور زمینداروں پر اتنا خراج عائد کرے

جو ان کے لئے قابل برداشت ہو. سب لوگوں نے حضرت عثمان بن حنیفؓ کے نام پر اتفاق کیا، اور کہا کہ ان کو اس کام کے لئے بھیج دیجئے. ان کو اس معاملے میں عقل و بصیرت اور تجربہ حاصل ہے، حضرت عمرؓ جلدی سے ان کے پاس گئے. اور انہیں سواد (عراق) کی زمین کی پیمائش کا حکم دیا. چنانچہ حضرت عمرؓ کی وفات سے ایک سال پہلے کوفہ کی زمینوں سے خراج کی آمدنی دس کروڑ درہم حاصل ہوئی" (۱)

یہ ہے واقعہ کی پوری تفصیل. اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے عراق کی زمینیں کسی سے چھینی نہیں تھیں. نہ وہ مملوک اراضی کو چھیننا جائز سمجھتے تھے. اس کے بجائے صورت حال یہ تھی کہ جو علاقہ فوجی طاقت استعمال کر کے فتح کیا جائے. اس میں اسلامی حکومت کو شرعاً دو باتوں کا اختیار حاصل ہوتا ہے. ایک یہ کہ وہ مفتوحہ اراضی ان کے سابق غیر مسلم مالکوں سے لے کر مجاہدین میں تقسیم کر دے، اور دوسرے یہ کہ وہ انہیں غیر مسلم مالکوں کے استعمال میں رہنے دے. البتہ ان پر خراج اور جزیہ عائد کر دے. یہ دونوں صورتیں اسلامی حکومت کے لئے یکساں طور پر جائز ہوتی ہیں، لیکن عراق اور شام کی فتوحات سے پہلے عموماً پہلے طریقے پر عمل کیا جاتا رہا. اور مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کی جاتی رہیں. اس بنا پر بعض حضرات کا خیال یہ تھا کہ عراق اور شام کی اراضی میں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے. لیکن حضرت عمرؓ نے محسوس فرمایا کہ اس طرح عالم اسلام کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور روز افزوں آبادی کے مسائل حل کرنے میں دشواری پیش آئے گی. اس لئے دوسری صورت اختیار فرمائی، جو یکساں طور پر جائز تھی، لیکن سابقہ طرز عمل کے خلاف ہونے کی بنا پر آپ نے اپنی رائے سے یہ فیصلہ نہیں کیا. بلکہ صحابہ کرام کے مشورے سے یہ اقدام کیا۔

۱۱۴۔ پھر **فقہاء** کرام کے درمیان اس مسئلے میں اختلاف رہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ زمینیں جب ان کے سابق غیر مسلم مالکوں کی تحویل میں چھوڑ دیں تو کس حیثیت سے چھوڑیں؟ کیا ان کے مالکانہ حقوق برقرار رکھے؟ یا ان اراضی کو تمام مسلمانوں کے لئے وقف عام قرار دیا؟ بعض فقہاء کرام. مثلاً امام مالک اور امام احمد رحمتہ اللہ **علیہما** فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے وہ زمینیں تمام مسلمانوں کے لئے وقف عام قرار دے دی تھیں. سابق مالکوں کو کاشتکار کے طور پر باقی رکھا گیا تھا. اور جو خراج وصول کیا جاتا تھا وہ زمینوں کا کرایہ تھا جو بیت المال میں جمع ہو کر مسلمانوں کی مصالح پر خرچ ہوتا تھا. چنانچہ ان مالکوں کے لئے یہ جائز نہیں تھا کہ وہ اپنی زمینیں فروخت کر

---

(۱) کتاب الخراج لابی یوسف. ص ۲۴ تا ۲۶۔

دیں، کیونکہ وہ مالک نہ تھے، اور وقف کی بیع جائز نہیں ہوتی۔ (۱)

۱۱۵۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے سابق مسلم مالکوں کی ملکیت برقرار رکھی تھی، ان کو ان اراضی پر مکمل مالکانہ حقوق حاصل تھے، وہ ان زمینوں کی خرید و فروخت کر سکتے تھے، البتہ ان زمینوں پر سالانہ خراج عائد کر دیا گیا تھا، جو بیت المال میں داخل ہو کر مسلمانوں کی ضروریات اور مصلحتوں کے مطابق خرچ ہوتا تھا، حضرت عمرؓ کے مذکورہ بالا واقعے میں جہاں زمینوں کے لئے "وقف" یا "حبس" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا مقصد ان کے نزدیک یہی ہے کہ ان زمینوں سے جو خراج حاصل ہو، وہ تمام مسلمانوں کی ضروریات پر خرچ ہو گا، یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اراضی اصطلاحی طور پر وقف ہو جائیں گی، چنانچہ علامہ ابن حزمؒ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

«قال أبوحنيفة: الإمام مخير، إن شاء قسمها، و إن شاء أوقفها فإن أوقفها فهي ملك الكفار الذين كانت عليهم».

> امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ امام کو اختیار ہے، چاہے تو اراضی تقسیم کر دے، اور چاہے تو انہیں وقف کر دے، پھر اگر وقف کرے گا تو وہ انہی کافروں کی ملکیت سمجھی جائے گی، جو فتح سے پہلے ان کے مالک تھے" (۱)

بلکہ علامہ ابن قیمؒ تو امام ابو حنیفہؒ کے علاوہ دوسرے ائمہ، جو اراضی عراق کے وقف ہونے کے قائل ہیں، ان کے بارے میں بھی یہی نقل کرتے ہیں کہ ان کی مراد بھی یہاں اصطلاحی "وقف" نہیں ہے، وہ فرماتے ہیں:

«فعلم أن الأرض لا تدخل في الغنائم، و الإمام يخير فيها بحسب المصلحة، وقد قسم رسول الله ﷺ، وترك عمر، ولم يقسم، بل أقرها على حالها، وضرب عليها خراجا مستمرا في رقبتها يكون للمقاتلة، فهذا معنى و قفها، ليس معناه الوقف الذي يمنع عن نقل الملك في الرقبة بل يجوز بيع هذه

---

(۱) المحلی لابن حزم، ص ۳۴۲ ج ۷۔

الأرض ، كما هو عمل الأمة . وقد أجمعوا على أنها تورث . والوقف لا يورث"

اس سے معلوم ہوا کہ زمین (اس) مال غنیمت میں داخل نہیں ہے، (جس کی تقسیم ضروری ہے) بلکہ امام کو اس بارے میں اختیار ہے کہ مصلحت کے مطابق عمل کرے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین تقسیم فرمائی تھی، حضرت عمرؓ نے چھوڑ دیا، اور تقسیم نہیں کیا، بلکہ اسے حسب سابق اپنے حال پر چھوڑ دیا، اور اس پر مسلسل خراج عائد کیا، جو مجاہدین پر خرچ ہوتا تھا، پس اراضی کے وقف ہونے کے یہ معنی ہیں، یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ ایسا وقف ہیں جو ملکیت کے انتقال سے مانع ہو، بلکہ ایسی زمینوں کی بیع جائز ہے، جیسا کہ امت کا عمل چلا آتا ہے، اور فقہاء کا اس پر اتفاق ہے، کہ ایسی خراجی زمین میں میراث بھی جاری ہوتی ہے، (۱) حالانکہ وقف میں میراث جاری نہیں ہوتی" (۲)

۱۱۶۔ اس سے واضح ہو گیا کہ امام ابو حنیفہؒ اور علامہ ابن قیمؒ وغیرہ کے نزدیک تو حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کا حاصل یہ تھا کہ پچھلے غیر مسلم مالکوں کی ملکیت زمینوں پر برقرار رکھی گئی تھی، (البتہ خراج عائد کر دیا گیا تھا) اگر ان کی تشریح کو اختیار کیا جائے تب تو اس فیصلے کو کسی بھی حال میں نیشنلائزیشن سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ ان اراضی کو حضرت عمرؓ نے وقف کر دیا تھا، لیکن یہ وقف عام اوقاف سے مختلف تھا، لہٰذا اس میں میراث بھی جاری ہوتی تھی، البتہ بعض فقہاء اس کو مکمل وقف قرار دیتے ہیں۔

۱۱۷۔ اگر بالفرض ان فقہاء کا موقف بھی اختیار کیا جائے جو ان اراضی کو "مکمل وقف" قرار دیتے ہیں، تب بھی حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کو نیشنلائزیشن سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ نیشنلائزیشن کے معنی یہ ہیں کہ ان زمینوں پر حکومت کو مکمل اختیار حاصل ہو جائے، اور وہ ان کی مالک بن کر اگر چاہے تو کسی وقت انہیں فروخت بھی کر سکے، حالانکہ "وقف" قرار دینے کے بعد

---

(۱) علامہ ابن قیمؒ کا یہ فرمانا محل نظر ہے کہ اس قسم کی خراجی زمین میں میراث جاری ہونے پر تمام فقہاء متفق ہیں، حقیقت یہ ہے کہ بعض فقہاء کے نزدیک ان زمینوں میں میراث بھی جاری نہیں ہوتی (ملاحظہ ہو دسوقی علی شرح مختصر خلیل ص۱۸۹ ج۲)

(۲) زادالمعاد لابن قیم ۔ ص۶۹ ج۲، مطبوعہ مصطفی البابی، ۱۳۴۷ھ بحث فتح مکہ۔

حکومت کا یہ اختیار ختم ہو جاتا ہے. کیونکہ وقف کی بیع نہیں ہو سکتی (جس کی بحث آگے آنے والی ہے) . اور حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کی یہ تشریح فقہاء اور محدثین میں سے کسی نے نہیں کی کہ انہوں نے عراق کی زمینوں کو سرکاری زمینیں قرار دے دیا تھا. اوپر حضرت عمرؓ کے اس واقعے کی جو تفصیل امام ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج سے نقل کی گئی ہے. اس میں بھی کہیں اس مفہوم کی گنجائش نہیں ہے. لہٰذا حضرت عمرؓ نے عراق کی زمینوں کے بارے میں جو فیصلہ کیا. اسے کسی بھی صورت میں نیشنلائزیشن قرار نہیں دیا جا سکتا۔

۱۱۸۔ مذکورہ بالا بحث سے مندرجہ ذیل امور واضح ہوتے ہیں:

(۱) عراق کی زمینوں کو حضرت عمرؓ نے نیشنلائزیشن نہیں کیا تھا. بلکہ پچھلے مالکوں کی ملکیت باقی رکھ کر ان پر خراج عائد کر دیا تھا. اور بعض فقہاء کہتے ہیں کہ انہیں وقف کر دیا تھا۔

(۲) یہ زمینیں کسی جائز مالک سے چھینی نہیں گئیں. نہ ان کو بلامعاوضہ ان سے لیا گیا. بلکہ یہ مفتوحہ زمینیں تھیں. ان کے بارے میں اسلامی حکومت کو وہ اختیارات حاصل ہیں جو اوپر بیان کئے گئے۔

(۳) حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کرتے وقت صاف لفظوں میں فرمایا کہ "اگر میں نے ان لوگوں سے کوئی ایسی چیز ظلماً لی ہوتی جو ان کی ملکیت ہوتی. اور وہ میں ان سے چھین کر کسی اور کو دے دیتا تو میں یقیناً شقاوت کا مرتکب ہوتا. "جس سے صاف واضح ہے کہ کسی مالک کو اس کی ملکیت سے اس کی مرضی کے بغیر بلامعاوضہ محروم کرنا ان کے نزدیک ہرگز جائز نہیں تھا۔

(۴) بجیلہ کے لوگوں کو حضرت فاروق اعظمؓ نے اس فیصلے سے پہلے زمینیں مالکانہ حقوق کے ساتھ دے دی تھیں. لیکن جب عراق کی تمام زمینوں میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے ان سے یہ اراضی واپس لینے کی رائے ہوئی تو آپ نے ان کو بلا کر پہلے راضی کیا، پھر ان کا مطلوبہ معاوضہ ادا کر کے وہ زمینیں واپس لیں۔

ان چار نکات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے عراق کی اراضی کے بارے میں جو فیصلہ فرمایا. اسے نہ صرف یہ کہ بلامعاوضہ زمینیں ضبط کر لینے کے جواز سے کوئی تعلق نہیں. بلکہ وہ صراحتاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کسی حکومت کے لئے کسی جائز مالک سے اس کی مملوکہ زمین بلامعاوضہ لینا ہرگز جائز نہیں ہے۔

گورنروں کے ذاتی مال کی ضبطی:

۱۱۹۔ ہمارے دور کے بعض حضرات نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک اور عمل سے لوگوں کی املاک بلامعاوضہ لینے پر استدلال کیا ہے، اور وہ یہ کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے بعض گورنروں مثلاً حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت حارثؓ کی ذاتی املاک میں سے آدھا حصہ ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر لیا تھا، ان حضرات کا کہنا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت مصالح عامہ کے تحت لوگوں کی املاک پر بلامعاوضہ قبضہ کر سکتی ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دلیل بھی انتہائی کمزور ہے، اور اس کا زیر بحث مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ مال کی یہ ضبطی اس بنیاد پر نہیں تھی کہ یہ مال چونکہ تم لوگوں کی ضرورت سے زائد ہے، اس لئے ضبط کیا جارہا ہے، بلکہ اس بنیاد پر تھی کہ حضرت عمرؓ کے خیال میں یہ مال ان گورنروں نے اپنی حدود اختیار سے تجاوز کر کے حاصل کیا تھا، چنانچہ اس واقعہ میں یہ تفصیل موجود ہے کہ حضرت عمرؓ نے پہلے ان سے پوچھا کہ یہ مال تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ انہوں نے جواب میں مختلف وجوہ بیان کیں، جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ہم تنخواہ کی بچت سے ذاتی تجارت بھی کرتے تھے، حضرت عمرؓ نے یہ عذر قبول نہیں کیا، اور فرمایا کہ "آپ لوگوں کو تجارت کے لئے وہاں نہیں بھیجا گیا تھا"۔ (۱)

غالباً حضرت عمرؓ کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تھا کہ:

«من استعملنا علی عمل، فرزقنا رزقا، فما أخذ بعد ذلك فهو غلول».

ہم نے جس شخص کو کوئی کام سونپا ہو، اور اس پر اسے تنخواہ دی ہو، تو اس کے بعد وہ جو کچھ حاصل کرے وہ خیانت ہے۔ (۲)

اور اس ارشاد کی روشنی میں حضرت عمرؓ یہ سمجھتے تھے کہ ان گورنروں کے لئے تنخواہ کے علاوہ اپنے لئے کسب معاش کا کوئی اور راستہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے، لہٰذا جو مال انہوں نے اس ذریعہ سے کمایا ہے، وہ ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے کی بنا پر قابل ضبطی ہے۔

۱۲۰۔ یہ اصول متعدد فقہاء کرام نے بیان فرمایا کہ سرکاری ملازمین کی دولت اگر ان کے ظاہری وسائل سے زیادہ ہو تو حکومت اسے ناجائز ہونے کی بنا پر ضبط کر سکتی ہے، فقہاء حنفی کی مشہور

---

(۱) العقد الفرید، ص ۴۴ و ۴۵ ج ۱۔ طبع بیروت ۱۴۰۴ھ۔

(۲) سنن ابی داؤد، ص ۱۲۱ ج ۲۔

کتاب "الدر المختار" میں ہے:

«إن مصادرة السلطان لأرباب الأموال لا تجوز إلا لعمال بيت المال مستدلاً بأن عمر رضي الله عنه صادر أبا هريرة».

سربراہ حکومت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مالکوں سے ان کے اموال بلامعاوضہ ضبط کر لے. البتہ بیت المال کے کارندوں کے مال کو اس طرح ضبط کرنا جائز ہے. جس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوہریرہ کے مال کو ضبط کیا تھا۔ (۱)

اسی مسئلہ کو علامہ ابن فرحون مالکیؒ نے علامہ ابن حبیب کے حوالے سے زیادہ تفصیل کے ساتھ تحریر فرمایا ہے. وہ حضرت عمرؓ کے مذکورہ فعل ہی سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

«إن للإمام أن يأخذ من قضاته و عماله ما وجد في أيديهم زائداً على ما ارتزقوه من بيت المال و أن يحصي ما عند القاضي حين ولايته ، و يأخذ منه ما اكتسبه زائداً على رزقه».

امام (سربراہ حکومت) کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے قاضیوں اور کارندوں کے قبضے میں جو مال ایسا پائے جو بیت المال سے ان کی حاصل کی ہوئی تنخواہ سے زائد ہو، اسے ضبط کر لے. اسے چاہئے کہ قاضی کے تقرر کے وقت اس کی املاک کو شمار کرے. اس کے بعد تنخواہ کے علاوہ جو مال زائد نظر آئے وہ اس سے لے لے۔ (۲)

خلاصہ یہ کہ سرکاری ملازمین کی بدعنوانیوں کے سدباب کے لئے یہ طریق کار اختیار کرنا جائز ہے اس صورت میں جو مال ضبط کیا جائے گا، وہ اس کے ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے کی بنا پر کیا جائے گا. حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسی بنیاد پر ان حضرات کا مال ضبط کیا.____ ہم پیچھے بار بار لکھ چکے ہیں کہ اگر کسی شخص کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے کوئی جائیداد ناجائز طریقے سے حاصل کی ہے، تو اسے اصل مالک کو لوٹانا. اور مالک معلوم نہ ہونے کی صورت میں اسے بحق سرکار ضبط کر لینا جائز ہے. لیکن یہاں بحث اس صورت کے بارے میں ہو رہی ہے جب یہ بات طے شدہ ہو کہ مالک نے ملکیت جائز طریقے پر حاصل کی ہے. لہٰذا حضرت عمر کے مذکورہ بالا عمل کا

---

(۱) الدر المختار. ص ۳۱۷ ج ۴. کتاب الکفالۃ۔

(۲) تبصرۃ الحکام لابن فرحون. ص ۱۵۰ و ۱۵۱. ج ۲. طبع بیروت. قسم ۳۔ فصل ۹۔

ہمارے زیر بحث مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۱۲۱۔ مذکورہ بالا تشریح سے واضح ہو گیا کہ حکومت کے لئے کسی شخص کی جائز ملکیت کو بلامعاوضہ اس سے لینا، خواہ مصالح عامہ کی غرض سے ہو، قرآن و سنت کے احکام کی رو سے جائز نہیں ہے، اور اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کے جتنے اقدامات سے مخالف استدلال کیا گیا ہے، ان میں سے کسی بھی اقدام سے بلامعاوضہ لے لینے کا جواز ثابت نہیں ہوتا، بلکہ حضرت عمرؓ نے (عراق کی زمینوں کے قصے میں) ایسے اقدام کو "ظلم" اور "شقاوت" سے تعبیر فرمایا ہے۔

معاوضہ دے کر املاک کی جبری وصولی

۱۲۲۔ اب میں مسئلے کے دوسرے حصے کی طرف آتا ہوں، یعنی "کیا کسی شخص کو جبراً معاوضہ دے کر اس سے اس کی کوئی ملکیت حاصل کی جا سکتی ہے؟"

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ معاوضہ دے کر زبردستی کسی سے اس کی ملکیت لے لینا درحقیقت ایک جبری بیع ہے، اور قرآن و سنت کے ارشادات کی روشنی میں شریعت کا اصل حکم یہی ہے کہ بیع فریقین کی باہمی رضامندی سے ہونی چاہئے، اور کوئی فریق دوسرے کو اس پر مجبور نہیں کر سکتا، اس سلسلے میں قرآن و سنت کے چند ارشادات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

«یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم»۔

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ، الا یہ کہ وہ کوئی تجارت ہو، جو تمہاری باہمی رضامندی سے ہوئی ہو۔ (۱)

یہ آیت دوسرے کا مال لینے کے بارے میں یہ واضح حکم دے رہی ہے کہ اس کے جائز ہونے کے لئے دو شرطیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ وہ تجارت (یعنی بیع) کے ذریعہ ہو، اور دوسرے یہ کہ یہ بیع باہمی رضامندی سے ہوئی ہو، اور کسی بھی فریق نے دوسرے کو اس پر مجبور نہ کیا ہو۔

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

(۱) سورۃ نساء ۴، ۲۹۔

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب النہی عن بیع المضطر، حدیث نمبر ۳۳۸۲۔

(۲) جامع الترمذی، کتاب البیوع، باب نمبر ۲۶، حدیث نمبر ۱۲۴۸ء

«قد نہی رسول اللہ ﷺ عن بیع المضطر».

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بیع سے منع فرمایا جس میں کسی شخص کو بیع پر مجبور کیا گیا ہو۔ (۱)

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لا یتفرقن عن بیع إلا عن تراض».

کوئی شخص بیع کر کے اس وقت تک نہ جائے جب تک باہمی رضامندی نہ ہو چکی ہو۔ (۲)

(۴) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إنما البیع عن تراض»

بیع تو باہمی رضامندی ہی سے ہوتی ہے۔ (۳)

(۵) ابو حرہ الرقاشی اپنے چچا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا یحل مال امرئ مسلم إلا بطیب نفس منہ»

کسی مسلمان شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں۔ (۴)

(۶) حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لا یحل لمسلم أن یأخذ عصا أخیہ بغیر طیب نفس منہ».

کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ اپنے بھائی کی لاٹھی بھی اس کی خوش دلی کے بغیر لے۔ (۱)

(۷) جبری بیع کے ناجائز ہونے کے سلسلے میں وہ واقعہ بطور خاص قابل ذکر ہے جس میں حضرت عمرؓ اور حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کے درمیان مسجد نبوی کی توسیع کے سلسلے میں

---

(۳) سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب نمبر ۱۸، حدیث نمبر ۲۱۸۵۔

(۴) مجمع الزوائد، ص۱۷۲ ج۴، بحوالہ مسند ابویعلی، و مشکوۃ المصابیح، ص۲۵۵ ج۱، بحوالہ شعب الایمان للبیہقی

(۱) موارد الظمآن للہیثمی، ص۲۸۳، المطبوعۃ السلفیۃ الروضۃ۔

اختلاف رائے پیش آیا تھا. اس کا مفصل واقعہ امام بیہقیؒ نے روایت کیا ہے.

حضرت (۲) ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی میں توسیع کا ارادہ فرمایا تو جس طرف آپ توسیع کرنا چاہتے تھے. وہاں حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کا گھر بیچ میں آ گیا. حضرت عمرؓ نے اسے مسجد میں داخل کرنے کے لئے حضرت عباسؓ کو معاوضہ دینا چاہا. حضرت عباسؓ نے انکار کیا. اور کہا کہ یہ زمین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عطا فرمائی تھی. دونوں میں اختلاف ہوا تو دونوں نے حضرت ابی بن کعبؓ کو ثالث مقرر کیا. اور حضرت ابی بن کعبؓ کے گھر پہنچے. حضرت ابی "سید المسلمین" (مسلمانوں کے سردار) کے لقب سے مشہور تھے. انہوں نے دونوں کو تکیہ پیش کیا. یہ حضرات ان کے سامنے بیٹھ گئے. حضرت عمرؓ نے ان سے اپنے ارادے کا اظہار فرمایا. اور دوسری طرف حضرت عباسؓ نے یہ عذر پیش کیا کہ یہ زمین مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی۔

حضرت ابی بن کعبؓ نے دونوں کی بات سننے کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے اور اپنے نبی داؤد علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ اللہ کے لئے ایک گھر بنائیں. حضرت داؤد نے پوچھا "پروردگار" یہ گھر کہاں ہو؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس جگہ جہاں تم دیکھ رہے ہو کہ ایک فرشتہ تلوار سونتے کھڑا ہے" حضرت داؤد علیہ السلام نے فرشتے کو صخرہ کے مقام پر دیکھا. لیکن وہاں اس وقت بنی اسرائیل کے ایک لڑکے کا گھر تھا. حضرت داؤد علیہ السلام اس کے پاس گئے. اور اس سے کہا کہ "کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ یہ گھر مجھ سے میری رضامندی کے بغیر لے لیں؟ حضرت داؤدؑ نے فرمایا: "نہیں" اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت داؤد پر وحی آئی کہ

---

(۱) موارد الظمآن للهيثمي ، ص ۲۸۳ ، المطبوعة السلفية الروضة

(۲) عن أبي هريرة قال : لما أراد عمر بن الخطاب رضي الله عنه أن يزيد في مسجد رسول الله ﷺ وقعت زيادته على دار العباس بن عبدالمطلب رضي الله عنه . فأراد عمر أن يدخلها في مسجد رسول الله ﷺ و يعوضه منها . فأبى . وقال : قطيعة رسول الله ﷺ ، واختلفا ، فجعلا بينهما أبي بن كعب رضي الله عنه ، فأتياه في منزله . وكان يسمى «سيد المرسلين» ، فأمرلها بوسادة . فألقيت لهما . فجلسا عليها بين يديه ، فذكر عمر ما أراد . وذكر

"میں نے تمہارے ہاتھ زمین کے خزانے دے دیئے ہیں. لہٰذا اسے راضی کرو." حضرت داؤد پھر اسکے پاس تشریف لائے. اور اس سے فرمایا کہ "مجھے یہ حکم ملا ہے کہ تمہیں راضی کروں. لہٰذا میں اس زمین کے بدلے تمہیں ایک قنطار سونا پیش کرتا ہوں" اس نوجوان نے کہا. اے داؤد. میں نے قبول کیا. لیکن یہ بتائیے کہ میری زمین بہتر ہے یا یہ قنطار؟ حضرت داؤدؑ نے فرمایا کہ "تمہاری زمین بہتر ہے" نوجوان نے کہا کہ "پھر مجھے راضی کیجئے" حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ "پھر تمہیں تین قنطار دیتا ہوں" اس کے بعد وہ نوجوان اپنے مطالبے میں سختی کرتا گیا. یہاں تک کہ نو قنطار پر راضی ہوا۔

جب حضرت ابی بن کعبؓ یہ واقعہ سنا چکے تو حضرت عباسؓ نے فرمایا: "کیا آپ نے میرے حق میں فیصلہ نہیں کر دیا؟ حضرت ابی کعبؓ نے فرمایا: "بیشک" حضرت عباسؓ نے یہ سن کر کہا کہ: اب میں آپ لوگوں کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنا وہ مکان کسی معاوضے کے بغیر فی سبیل اللہ مسجد کو دیدیا"

یہی واقعہ طبقات ابن سعد میں بھی مروی ہے. اور اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ شروع میں جب حضرت داؤد علیہ السلام نے اس نوجوان کو زمین بیچنے کی ترغیب دی تو اس نے انکار کر دیا تھا. اس پر

العباس قطيعة رسول الله ﷺ . فقال أبي : إن الله عز و جل أمر عبده و نبيه داؤد عليه أن يبني له بيتاً . قال : أي رب ! و أين هذا البيت؟ قال : حيث ترى الملك شاهراً سيفه . فرآه على الصخرة . و إذا ما هناك يومئذ اندر لغلام من بني إسرائيل . فأتاه داؤد . فقال : إني قد أمرت أن أبني هذا المكان بيتا لله عز و جل . فقال له الفتى : آلله أمرك أن تأخذ مني بغير رضاي؟ قال : لا . فأوحى الله إلى داؤد عليه السلام : «إني قد جعلت في يدك خزائن الأرض فأرضه» فأتاه داؤد . فقال : إني قد أمرت برضاك فلك بها قنطار من ذهب . قال : قد قبلت يا داؤد ! و هي خير أم القنطار؟ قال : بل هي خير . قال : فأرضني . قال : فلك بها ثلاث قناطير . قال : فلم يزل يشدد على داؤد حتى رضي منه بتسع قناطير

انہوں نے اس سے زبردستی لینے کا ارادہ فرمایا تھا، لیکن وحی نازل ہوئی کہ "اے داؤد! میں نے تم کو اپنا گھر تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا، جس میں میرا ذکر کیا جائے، لیکن تم میرے گھر میں غضب کو داخل کرنا چاہتے ہو، حالانکہ غضب میری شان نہیں، تمہاری سزا یہ ہے کہ تم اب اس گھر کو نہیں بناؤ گے۔ حضرت داؤد نے فرمایا کہ "پھر میری اولاد میں سے کسی کو توفیق دے دی جائے۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا" ہاں! تمہاری اولاد بنائے گی" چنانچہ بعد میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس تعمیر کیا۔

ابن سعد کی روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت ابی بن کعب نے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ انہوں نے یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا، حضرت عمرؓ مزید توثیق کے لئے انہیں مسجد نبوی میں لے آئے، جہاں اور بھی صحابہ کرام موجود تھے، اور ان سے فرمایا کہ اگر کسی اور نے بھی حضرت داؤد علیہ السلام کا یہ واقعہ سنا ہو تو بتائے، اس کے جواب میں حضرت ابوذر غفاریؓ نے فرمایا کہ میں نے بھی یہ واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، ان کے بعد دو مزید صحابہ نے بھی اعلان کیا کہ انہوں نے بھی یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا۔ (۱)

۱۲۳۔ قرآن وسنت کے ان ارشادات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شرعاً وہی بیع معتبر اور قابل نفاذ ہے جو فریقین کی رضامندی سے وجود میں آئی ہو، کسی شخص کو زبردستی اس کی مرضی کے خلاف بیع پر مجبور کر کے اس سے کوئی چیز خریدنا جائز نہیں، اور ایسی بیع شرعاً معتبر بھی نہیں ہوتی، چنانچہ فقہاء کرام نے ایسی بیع کو فاسد قرار دیا ہے، علامہ حصکفیؒ لکھتے ہیں:

«بیع المضطر و شرائوه فاسد»

جس شخص کو اس کی رضامندی کے بغیر معاملے پر مجبور کیا گیا ہو اس کی بیع و شراء فاسد ہے۔

بلکہ اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامیؒ نے اس صورت کو بھی شامل کیا ہے جب کوئی شخص اپنے ذاتی حالات کے تحت کوئی چیز بیچنے پر مجبور ہو گیا ہو، اور خریدار اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے

فقال العباس: أليس قد قضيت لي بها؟ وصارت لي؟ قال: بلى، قال: فإني أشهدك أني قد جعلتها له»

(السنن الكبرى للبيهقي ص ١٦٨ ج ٦)

(۱) طبقات ابن سعد، ص ۲۱ و ۲۲ ج ۴، ترجمۃ عباس بن عبدالمطلب۔

ہوئے قیمت اتنی کم لگائے جو بازاری نرخ کے لحاظ سے بہت کم ہو. اس کو بھی انہوں نے "بیع المضطر" قرار دیا ہے۔ (۱)

بہرصورت. اسلام کا اصل حکم تو یہی ہے کہ کسی شخص کو بیع پر مجبور کرنا نہ کسی فرد کے لئے جائز ہے. نہ حکومت کے لئے۔

۱۲۴۔ البتہ بعض ناگزیر حالات میں ایسی استثنائی صورتیں نکل سکتی ہیں جن میں کسی شدید ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جبری بیع کا طریقہ اختیار کئے بغیر چارہ نہ ہو. صرف ایسے مواقع پر شریعت نے جبری بیع کی اجازت دی ہے. اور اس اجازت کا ماخذ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔

جامع ترمذی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

«قلت : يا رسول الله! إنا نمرّ بقوم فلاهم يضيفونا ولاهم يئودون مالنا عليهم من الحق ، ولا نحن نأخذ منهم ، فقال رسول الله ﷺ : إن أبوا إلا أن تأخذوا كرها فخذوا»

میں نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم کسی قوم کے پاس سے گزرتے ہیں. تو نہ وہ ہماری مہمان داری کرتے ہیں. اور نہ وہ حقوق ادا کرتے ہیں جو ہمارے ان پر واجب ہیں. اور نہ ہم ان سے لیتے ہیں اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ زبردستی کئے بغیر انکار ہی کرتے رہیں تو ان سے زبردستی لے لو۔

امام ترمذی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«إنما معنى هذا الحديث أنهم كانوا يخرجون في الغزو ، فيمرون بقوم ، ولا يجدون من الطعام ما يشترون بالثمن ، فقال النبي ﷺ : إن أبوا أن يبيعوا إلا أن تأخذوا كرهاً فخذوا ، هكذا مروى في بعض الحديث مفسراً»

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ صحابہ کرام جہاد کے لئے جایا کرتے تھے. وہ کسی قوم کے پاس سے گزرتے تھے. اور کوئی ایسا کھانا موجود نہیں ہوتا تھا جسے وہ قیمت دے کر خرید سکیں. اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ لوگ زبردستی

---

(۱) رد المحتار. ص ۱۱۸ ج ۴۔

کئے بغیر بیچنے سے انکار کریں تو ان سے زبردستی لے لو، بعض احادیث میں اس واقعے کی یہی تفصیل مروی ہے۔ (۱)

اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

«الإجازة لهم أن يأخذوا بالقيمة كرهاً ، و توجيه الحديث أن الكفار كانوا إذا نزل المسلمون أغلقوا دكاكينهم ، وتركوا المبايعة إضراراً بالمسلمين ، فلما رأى المسلمون ذلك شكوا إلى رسول الله ﷺ أن هؤلاء لا يضيفوننا ، ولا شكاية فى ذلك لأن الضيافة تبرع و إكرام ، وليس حقاً ثابتاً ، إنما الشكوى أنهم لا يؤدون إلينا بحق و هو الشراء والإيتاء بالقيمة. فكأنهم ذكروا فى كلامهم الطرق الثلاث المحتملة للأخذ ، وهو الأخذ بالقيمة ، أو الأخذ بغير قيمة جبرا منا ، أو إكراماً منهم ، أما الأول ، فلأنهم لا يبايعوننا ، و أما الثانى فلأنك يا رسول الله منعتنا أن نأخذ مال الغير بغير حق ، وهو المعنى بقولهم «ولا نحن نأخذ منهم» و أما الثالث فلأنهم لا يضيفوننا»

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قیمت دے کر زبردستی لینے کی اجازت دی ہے، اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمان کسی بستی کے پاس پڑاؤ ڈالتے ہیں تو یہ غیر مسلم اپنی دکانیں بند کر دیتے، اور بیچنا چھوڑ دیتے، تاکہ مسلمانوں کو تکلیف ہو، جب مسلمانوں نے یہ دیکھا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ یہ لوگ ہماری مہمانی نہیں کرتے، اس میں تو کوئی شکایت کی بات نہ تھی، کیونکہ مہمانی تو رضاکارانہ ہوتی ہے، اور اکرام ہوتا ہے، وہ کوئی واجب الادا حق نہیں ہے، لیکن شکایت یہ تھی کہ وہ ہمیں جائز طریقے پر خریدنے بھی نہیں دیتے، اور قیمت لے کر بھی کھانا دینے سے انکار کرتے ہیں، گویا انہوں نے تینوں ممکن طریقوں کا ذکر کیا، ایک یہ کہ ان سے قیمت دے کر لیا جائے، دوسرے یہ کہ

(۱) جامع الترمذی، کتاب السیر، باب ۳۲، حدیث نمبر ۱۵۸۹، ص ۱۳۸ ج ۴ مطبوعہ بیروت۔

ہم بغیر قیمت کے ان سے جبراً وصول کر لیں. اور تیسرے یہ کہ وہ ہمارا اکرام کرتے ہوئے ہماری مہمانی کریں. پہلی صورت اس لئے ممکن نہیں کہ وہ ہم سے بیع کرنے پر تیار نہیں ہوتے. دوسری اس لئے ممکن نہیں کہ یا رسول اللہ! آپ نے ہمیں دوسرے کا مال ناحق طور پر لینے سے منع فرمایا ہے. اور انہوں نے جو کہا کہ "نہ ہم ان سے لیتے ہیں" اس سے یہی مراد ہے. اور تیسری صورت اس لئے ممکن نہیں کہ وہ ہماری مہمانی نہیں کرتے" (۱)

چنانچہ قاضی ابو بکر ابن عربیؒ اس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وكذالك إذا نزلت بالناس مخمصة ، و عند بعضهم طعام ، لزمهم البيع منهم فإن أبوا أجبروا عليه»

اسی طرح جب لوگوں پر بھوک کی حالت مسلط ہو. اور بعض لوگوں کے پاس کھانا موجود ہو توان پر اس کھانے کی بیع لازم ہو جاتی ہے. اگر وہ انکار کریں تو انہیں اس پر مجبور کیا جائے گا" (۱)

جبری بیع کے سلسلے میں مجھے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی اور ارشاد یا عمل اس کے سوا نہیں مل سکا. تاہم اس سے اتنی بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ شدید ضرورت کے مواقع پر. جیسا کہ جنگ وغیرہ کے غیر معمولی حالات میں ہوتی ہے. آپ نے جبری خریداری کی اجازت عطا فرمائی۔

۱۲۵۔ خلفائے راشدین کے عہد مبارک میں ایک واقعہ مسجد حرام کی توسیع کے سلسلے میں ملتا ہے. یہ واقعہ امام ابو الولید ازرقیؒ نے مندرجہ الفاظ میں روایت کیا ہے:

عن ابن جريج ، قال : كان المسجد الحرام ليس عليه جدران محاطة ، إنما كانت الدور محدقة به من كل جانب ، غير أن بين الدور أبواباً يدخل منها الناس من كل نواحيه فضاق على الناس ، فاشترى عمر بن الخطاب رضي الله عنه دوراً فهدمها ، وهدم على من قرب من المسجد ، وأبى بعضهم أن يأخذ الثمن و تمنع من البيع ، فوضعت أثمانا في خزانة الكعبة حتى أخذوها

(۱) الکوکب الدری. ص۴۱۹ ج ۱. مطبوعہ سہارنپور. انڈیا۔

(۱) عارضۃ الاحوذی. ص۸۷ ج۷ مطبوعہ مصر. ۱۳۵۰ھ

بعد ، ثم أحاط عليه جدارا قصيرا وقال لهم عمر : إنما نزلتم على الكعبة ، فهو فناء ها ولم تنزل الكعبة عليكم ، ثم كثر الناس فی زمن عثمان بن عفان رضی الله عنه ، فوسع المسجد و اشتری من قوم و أبی آخرون أن يبيعوا ، فهدم عليهم فصيحوا به ، فدعاهم ، فقال : إنما جرأكم علی حلمی عنكم ، فقد فعل بكم عمر هذا ، فلم يصح به أحد ، فاحتذيت علی مثاله ، فصيحتم بی ، ثم أمربهم إلی الحبس ، حتی كلمه فيهم عبدالله بن خالد بن أسيد فتركهم»

حضرت ابن جریج فرماتے ہیں کہ: پہلے مسجد حرام کے گرد کوئی چار دیواری نہیں تھی. بلکہ اسے چاروں طرف سے گھروں نے گھیرا ہوا تھا. البتہ گھروں کے درمیان دروازے تھے. جن کے ذریعہ لوگ مسجد میں داخل ہوتے تھے. پھر مسجد لوگوں کے لئے تنگ ہو گئی. تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گھروں کو خرید کر انہیں منہدم کر دیا. اور جن لوگوں کے گھر مسجد کے بالکل قریب تھے. انہیں گروا دیا. لیکن بعض لوگوں نے قیمت لینے اور گھر بیچنے سے انکار کر دیا. چنانچہ ان کے گھروں کی قیمتیں کعبے کی الماری میں رکھ دی گئیں. یہاں تک کہ بعد میں انہوں نے لے لیں. اس کے بعد حضرت عمرؓ نے مسجد کے گرد ایک چھوٹی سے دیوار بنوا دی. اور جو لوگ بیچنے سے انکار کر رہے تھے.. ان سے فرمایا کہ "تم کعبے پر آکر اتر گئے ہو. جب کہ یہ جگہ کعبے کا صحن تھی اور کعبہ تم پر آکر نہیں اترا" پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں لوگوں کی تعداد اور زیادہ ہو گئی تو انہوں نے مسجد حرام میں توسیع کی. اور کچھ لوگوں سے جگہ خرید لی. اور بعض لوگوں نے بیچنے سے انکار کیا. بالآخر حضرت عثمانؓ نے ان کے گھر منہدم کرا دیئے. اس پر لوگوں نے احتجاج کیا تو تو حضرت عثمانؓ نے انہیں بلوایا. اور فرمایا کہ "میرے حلم نے تم لوگوں کو جری کر دیا ہے. حضرت عمرؓ نے تمہارے ساتھ یہی معاملہ فرمایا تھا. اس پر کسی نے احتجاج نہیں کیا. میں نے انہیں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی تو تم احتجاج کرتے ہو". اس کے بعد ان لوگوں کو قید کرنے کا حکم دیا. لیکن عبداللہ بن خالد بن اسیدؓ کی گفتگو کے نتیجے میں انہیں چھوڑ دیا" (۱)

(۱) تاریخ مکہ للازرقیؒ ص۶۸ و ۶۹ ج ۲ مطبوعہ مکہ مکرمہ ۱۴۰۳ھ۔

علامہ تقی الدین فاسیؒ نے یہ واقعہ ازرقیؒ ہی سے نقل کرنے کے بعد بتایا ہے کہ حضرت عمرؓ ہی کے زمانے میں مسجد حرام کی جو توسیع ہوئی۔ یہ واقعہ ۱۷ھ کا ہے۔ اور حضرت عثمانؓ کی توسیع کا واقعہ ۲۶ھ کا۔ (۱)

۱۲۶۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عباسؓ کے درمیان مسجد نبوی کی توسیع کے وقت جو اختلاف پیش آیا تھا۔ بظاہر حضرت ابی بن کعبؓ کے فیصلے کے بعد حضرت عمرؓ بھی مطمئن ہو گئے تھے۔ کہ کسی شخص کو اپنی ملکیت فروخت کرنے پر اس کی مرضی کے خلاف مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ پھر مسجد حرام کے اس واقعے میں انہیں جبری طور پر لوگوں کے مکانات کس بنیاد پر خریدے؟

۱۲۷۔ اس سوال کا جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ کی زمینوں کی حیثیت دوسری زمینوں سے مختلف ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

سَوَاءً ن العاکف فیه و الباد

اس بیت اللہ میں یہاں کے مقیم اور باہر سے آنے والے سب برابر ہیں"

اس کی وجہ سے فقہاء کی ایک بڑی جماعت اس بات کی قائل ہے کہ یہاں کی زمینیں کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا ان کی بیع و شراء بھی جائز نہیں ہے۔ اور حضرت عمرؓ نے مکہ مکرمہ کے باشندوں پر اسی قرآنی ارشاد کی وجہ سے یہ حکم عائد کیا تھا کہ وہ حاجیوں پر اپنے گھروں کے دروازے بند نہ کریں۔ اور حاجیوں کو اجازت دی تھی کہ وہ جس گھر یا جگہ کو خالی پائیں، اس میں آ کر ٹھہر جائیں۔ (۲)

۱۲۸۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے معترضین کے جواب میں یہ فرمایا کہ "تم کعبے پر آ کر اتر گئے ہو۔ جب کہ یہ جگہ کعبے کا صحن تھی، کعبہ تم پر آ کر نہیں اترا" گویا وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ جگہ کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ کعبہ کی ضروریات کے لئے وقف ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے اس جگہ پر تعمیرات کر رکھی ہیں۔ وہ ایک وقف جگہ پر کی ہوئی تعمیرات ہیں، جنہیں وقف کی مصلحت کے پیش نظر جب چاہیں ہٹایا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں جو قیمت ان لوگوں کو ادا کی گئی وہ صرف تعمیر کی قیمت تھی، جگہ کی نہیں۔ حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے اس واقعے کی یہی توجیہ کی ہے۔ (۱)

---

(۱) شفاء الغرام باخبار البلد الحرام للفاسی، ص ۲۲۴ ج ا۔

(۲) کتاب الاموال لابی عبید۔ ص ۶۶۔

(۱) اعلاء السنن، ص ۲۰۳ و ۲۰۴ ج ۱۳۔

۱۲۹۔ اور دوسرا جواب یہ بھی ممکن ہے کہ شدید اور ناگزیر مواقع پر جبری بیع کی اجازت حضرت عقبہ بن عامرؓ کی اس حدیث سے ثابت ہے جو اوپر ذکر کی گئی ہے۔ لیکن اس اجازت کو بہت احتیاط کے ساتھ صرف ایسے مواقع پر استعمال کیا جاسکتا ہے جہاں ضرورت اتنی شدید ہو کہ اس عمل کے بغیر چارہ نہ رہے۔ مسجد نبوی کی توسیع کے سلسلے میں حضرت عمرؓ اور حضرت عباسؓ کے درمیان جو قضیہ پیش آیا، وہاں صورت یہ تھی کہ حضرت عمرؓ ایسی ضرورت سمجھ رہے تھے۔ لیکن حضرت عباسؓ کی رائے میں ضرورت اس درجے کی نہیں تھی۔ کہ اس کی بنا پر بیع کے عام اصول میں استثناء پیدا کیا جا سکے۔ اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ حضرت عباسؓ یہ محسوس کرتے ہوں کہ حضرت عمرؓ تو اس وقت ضرورت کے تحت یہ اقدام کر رہے ہیں۔ لیکن انہیں اندیشہ یہ تھا کہ ان کا یہ عمل آئندہ کے لئے نظیر بن جائے گا۔ اور لوگ اسے شدید ضرورت کے بغیر بھی بے دریغ استعمال کرنا شروع کر دیں گے۔ لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ اس مسئلے کی ضروری وضاحت ہو جائے کہ شدید ضرورت کے بغیر اس طرح کی جبری خریداری جائز نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت ابی بن کعبؓ کے فیصلے کے بعد جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو حضرت عباسؓ نے رضاکارانہ طور پر اپنا مکان حضرت عمرؓ کے حوالے کر دیا۔

۱۳۰۔ دوسری طرف مسجد حرام کے معاملے میں شدید ضرورت واضح تھی۔ اس لئے کہ مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے بیت اللہ ہی تعمیر ہوا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگ جب چاہیں۔ اور جتنی تعداد میں چاہیں، یہاں آکر عبادت کریں۔ لہٰذا کعبے کے آس پاس کی جگہ اصل میں کعبہ ہی کی ضروریات کے لئے ہونی چاہئے تھی۔ لوگ اپنے طور پر یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ جب ان کی آبادی کی وجہ سے اصل مقصد میں خلل آنے لگا۔ اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اس آبادی سے ہٹ کر کسی اور جگہ مسجد تعمیر کر دی جائے۔ کیونکہ کوئی بھی مسجد بیت اللہ اور مسجد حرام کا بدل نہیں بن سکتی۔ تو اس آبادی کو ہٹانا جو بیت اللہ کی تعمیر کے اصل مقصد میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ ایسی ناگزیر ضرورت تھی کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ اس موقع پر بعض لوگوں نے اپنی ذاتی مشکلات کی بنا پر تو اعتراض کیا۔ لیکن ایک علمی مسئلے کے طور پر کسی صحابی کا اس عمل پر کوئی اعتراض ثابت نہیں ہے۔

۱۳۱۔ لہٰذا ان دونوں واقعات کے مجموعے سے جو بات سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ اصل قاعدہ یہی ہے کہ کسی شخص کی جائیداد کی جبری خریداری جائز نہیں ہے۔ لیکن نہایت شدید اور ناگزیر ضرورت کے موقع پر اس کی گنجائش ہے۔

۱۳۲۔ چنانچہ فقہاء کرام نے اسی اصول کے مطابق کئی ضروریات کے لئے جبری خریداری کو جائز قرار دیا ہے۔ جس کی چند مثالیں ذیل میں پیش کرتا ہوں:

(۱) فقہ حنفی کی مشہور کتاب "در مختار" میں ہے:

توخذ أرض و دار و حانوت بجنب مسجد ضاق على الناس بالقيمة كرهاً

جو مسجد لوگوں کے لئے تنگ ہو گئی ہو، اور اس کے قریب کوئی زمین یا گھر یا دوکان ہوں تو اسے قیمت کے ذریعہ زبردستی لیا جاسکتا ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

لما روی عن الصحابة رضی الله عنهم لما ضاق المسجد الحرام أخذوا أرضين بكره من أصحابها بالقيمة و زاد وافى المسجد الحرام، بحر عن الزيلعي، قال فى نور العين: ولعل الأخذ كرها ليس فى كل مسجد ضاق، بل الظاهر أن يختص بمالم يكن فى البلد مسجد آخر، إذ لو كان فيه مسجد آخر يمكن دفع الضرورة بالذهاب إليه، نعم فيه حرج، لكن الأخذ كرها أشد حرجاً منه، ويؤيد ما ذكرنا فعل الصحابة، إذ لا مسجد فى مكة سوى المسجد الحرام»

اس کی دلیل یہ ہے کہ جب مسجد حرام تنگ پڑ گئی تو صحابہ کرام سے مروی ہے کہ انہوں نے مالکان سے ان کی زمینیں قیمت دے کر زبردستی لیں، اور مسجد حرام میں اضافہ کیا۔ (بحر عن الزیلعی ۔) اور صاحب نور العین کہتے ہیں کہ شاید زبردستی لینے کا جواز ہر اس مسجد کے لئے نہیں ہے جو تنگ پڑ جائے، بلکہ اس صورت کے ساتھ خاص ہے جب کہ شہر میں کوئی اور مسجد نہ ہو، اس لئے کہ اگر کوئی اور مسجد ہو تو وہاں جاکر نماز پڑھنے سے ضرورت پوری ہو سکتی ہے، ہاں اس میں دقت تو ہے، لیکن زبردستی لینے میں اس سے زیادہ دقت ہے۔ اور ہماری اس بات کی تائید صحابہ کے عمل سے بھی ہوتی ہے، کیونکہ مکہ مکرمہ میں مسجد حرام کے سوا کوئی اور مسجد نہیں" (۱)

(۲) فقہ مالکی کے مشہور عالم علامہ مواق لکھتے ہیں:

---

(۱) رد المحتار، ص ۴۲۱ ج ۳، کتاب الوقف۔

«ویکرہ الناس السلطان علی بیعها إذا احتاج الناس إلیها لجامعهم الذی فیه الخطبة، وکذلك الطریق إلیها. لا إلی المسجد التی لا خطبة فیها والطرق التی فی القبائل لأقوام»

اگر لوگوں کو اپنی ایسی جامع مسجد کے لئے گھروں کی جگہ کی ضرورت ہو جس میں خطبہ ہوتا ہو، یا اس کی جامع مسجد تک جانے کے لئے راستے کی ضرورت ہو تو سلطان مالکوں کو اس کی بیع پر مجبور کر سکتا ہے. لیکن جن مسجدوں میں خطبہ نہیں ہوتا. یا قبائل کے لئے بنے ہوئے راستوں میں توسیع کے لئے بیع پر مجبور کرنا جائز نہیں۔ (۲)

(۳) فقہ حنفی کی مشہور کتاب "فتاویٰ قاضی خان" میں ہے:

«قالوا: وللسلطان أن یجعل ملك الرجل طریقا عند الحاجة»

فقہاء نے کہا ہے کہ سلطان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ضرورت کے وقت کسی شخص کی ملکیت کو راستہ قرار دے دے" (۱)

(۴) اسی اصول کو خلافت عثمانی کے دور میں مدون کردہ قانون "مجلة الاحکام العدلیة" میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

لدی الحاجة یئوخذ ملك کائن من کان بالقیمة بأمر السلطان و یلحق بالطریق، لکن لا یئوخذ من یدہ مالم یود له الثمن»

ضرورت کے وقت سلطان کے حکم سے ہر شخص کی ملکیت خواہ وہ کوئی ہو، قیمت ادا کر کے لی جا سکتی ہے. اور اسے راستے میں شامل کیا جا سکتا ہے. لیکن اس کے قبضے سے اس وقت تک نہیں لی جائے گی جب تک اسے قیمت ادا نہ کر دی گئی ہو۔ (۲)

(۵) امام محمد بن حسن شیبانیؒ جو امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ہیں، اسلام کے بین الاقوامی قانون پر اپنی معروف کتاب "السیر الکبیر" میں یہ مسئلہ تحریر فرماتے ہیں کہ اگر جنگ کے دوران امیر لشکر کو

---

(۲) التاج والاکلیل. للمواق. بهامش الحطاب. ص ۴۲ ج ۶ کتاب الوقف۔

(۱) فتاویٰ قاضی خان. ص ۲۳۶. ج ۱. کتاب الزکوٰة. فصل احیاء الموات۔

(۲) مجلة الاحکام العدلیه. دفعہ نمبر ۱۲۱۶۔

مرکز کی طرف کوئی ایلچی بھیجنے کی ضرورت پیش آئے، اور ایلچی کے لئے کوئی فالتو گھوڑا موجود نہ ہو، تو اسے چاہئے کہ کسی گھوڑے کے مالک سے گھوڑا مستعار لینے کی کوشش کرے۔ لیکن:

و إن أبى أن يعطيه الفرس ولم يجد الإمام بداً من أن يأخذ الفرس منه فيدفعه إلى الرسول لضرورة جاءت للمسلمين فلا بأس بأن يأخذ منه كرهاً »

اگر گھوڑے کا مالک گھوڑا دینے سے انکار کر دے، اور امیر کے پاس اس گھوڑے کو حاصل کئے بغیر چارہ نہ ہو، کیونکہ مسلمانوں کو ایک ضرورت ایسی پیش آگئی ہے کہ وہ گھوڑا ایلچی کو دینا ضروری ہو گیا ہے، تو ایسی صورت میں وہ گھوڑا اس سے زبردستی لے سکتا ہے"

شمس الائمہ سرخسیؒ اس کی دلیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لأنه نصب ناظرا، وعند الضرورة يجوزله أن يأخذ مال الغير بشرط الضمان»

اس لئے کہ امیر کو نگران مقرر کیا گیا ہے، اور ضرورت کے موقع پر اس کے لئے جائز ہے کہ کسی دوسرے کا مال لے لے، بشرطیکہ اس کا معاوضہ ادا کرے" (۱)

(۲) احتکار، یعنی گراں فروشی کی غرض سے اشیاء ضرورت کی ذخیرہ اندوزی، حدیث کی رو سے ناجائز ہے، اب اگر کسی شخص نے ایسی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی کر رکھی ہو جن کی بستی میں قلت ہے، اور لوگوں کو ان کی ضرورت ہے، تو فقہاء کرام نے اس صورت میں بھی قاضی کو اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ ایسے ذخیرہ اندوزوں کو ان اشیاء ضرورت کی فروخت پر مجبور کر سکتا ہے، اس سلسلے میں فقہ حنفی کی کتاب "الاختیار" میں مسئلے کی تفصیل بیان کی گئی ہے:

«و إذا رفع إلى القاضي حال المحتكر يأمره ببيع ما يفضل من قوته و عياله فإن امتنع باع عليه، لأنه في مقدار قوته و عياله غير محتكر، ويترك قوتهم على اعتبار السعة. وقيل: إذا رفع إليه أول مرة نهاه عن الاحتكار، فان

(۱) شرح السیر الکبیر، ص ۲۴۵ ج ۲۔ مطبوعہ دکن۔

رفع إليه ثانيا حبسه و عزره بما يرى زجراله، ودفعا للضرر عن الناس. قال محمد: أجبر المحتكرين على البيع ما احتكروا ولا أسعر، ويقال له: بع كما يبيع الناس و بالزيادة يتغابن الناس في مثلها، ولا أتركه يبيع بأكثر.... وقد قال أصحابنا: إذا خاف الإمام على أهل مصر الضياع و الهلاك أخذ الطعام من المحتكرين، وفرقه عليهم، و إذا وجدوا ردوا مثله، وليس هذا حجرا، و إنما هو للضرورة، كما في المخمصة»

اگر قاضی کے پاس ذخیرہ اندوزی کرنے والے کا معاملہ لایا جائے، تو وہ اسے حکم دے کہ جتنی غذائی اشیاء اس کے اپنے اور اس کے اہل و عیال کی ضرورت سے زائد ہوں، انہیں بیچ دے، اگر وہ انکار کرے تو قاضی اس کی طرف سے بیچ دے، اس لئے کہ اپنی اور اپنے عیال کی غذائی ضرورت کی حد تک وہ ذخیرہ اندوزی کا مرتکب نہیں ہے، اور ان کی غذائی ضرورت کا اندازہ اس کی وسعت کے مطابق کیا جائے گا، اور بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ جب کسی ایسے شخص کا معاملہ پہلی بار پیش ہو تو قاضی اسے احتکار سے منع کرے، اگر دوبارہ وہ (احتکار کے جرم میں) پیش ہو تو اسے قید کر دے جو اسے اس کے عمل سے روک سکے، اور لوگوں کی تکلیف دور ہو، امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ میں ذخیرہ اندوزی کرنے والوں کو بیع پر مجبور کروں گا، لیکن کوئی خاص قیمت بیع کے لئے مقرر نہیں کروں گا، اس کے بجائے اس سے کہا جائے گا کہ تم اسی طرح فروخت کرو جیسے لوگ فروخت کر رہے ہیں، اور اگر وہ تھوڑی سی زیادتی کے ساتھ بھی بیچ دے جس کی عموماً لوگ پرواہ نہیں کرتے، تو بھی کچھ حرج نہیں، لیکن میں اس سے زیادہ قیمت لے کر بیچنے کی اجازت نہیں دوں گا، .... اور ہمارے فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کسی سربراہ حکومت کو کسی شہر والوں کے بارے میں اندیشہ ہو کہ وہ بھوک کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں گے، تو وہ ذخیرہ اندوزوں سے غذائی اشیاء لے کر ان میں تقسیم کر دے گا، پھر جب ان لوگوں کو استطاعت ہو وہ اتنا ہی واپس کر دیں گے" (۱)

---

(۱) الاختیار لتعلیل المختار، لموصلیؒ ص ۱۶۱ ج ۴، کتاب الکراہیۃ۔

یہ مسئلہ اور بھی فقہاء کرام نے لکھا ہے، (ملاحظہ ہو، بدائع الصنائع، ص ۱۲۹ ج ۵، الطرق الحکمیۃ لابن قیم، ص ۲۸۴

۱۳۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث، خلفائے راشدین کے عمل، اور فقہاء کرام کی مذکورہ بالا تصریحات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی شخص کو اپنی ملکیت فروخت کرنے پر مجبور کرنا عام حالات میں تو بالکل جائز نہیں ہے، لیکن کسی ناگزیر ضرورت کی بنا پر حکومت اسلامی کسی شخص کو بیع پر مجبور کر سکتی ہے۔

۱۳۴۔ اب سوال یہ ہے کہ اس ضرورت کا معیار کیا ہوا؟ اس سلسلے میں فقہاء کرام نے اصول فقہ میں چند درجات بیان فرمائے ہیں، جنہیں ضرورت، حاجت، منفعت، زینت اور فضول کی اصطلاحات سے تعبیر فرمایا ہے:

ضرورت کی تعریف عموماً فقہاء نے اس طرح کی ہے:

بلوغه حدا إن لم يتناول الممنوع هلك، أوقارب، كالمضطر للأكل و اللبس، بحيث لو بقى جائعا أو عريانا هلك أو تلف منه عضو، وهذا يبيح تناول المحرم

کسی کا ایسی حد پر پہنچ جانا کہ اگر وہ ناجائز کام کا ارتکاب نہ کرے، تو یا بالکل ہلاک ہو جائے گا، یا ہلاکت کے قریب پہنچ جائے گا، مثلاً وہ شخص جو کھانے یا پہننے پر اتنا مجبور ہو کہ اگر بھوکا یا برہنہ رہے تو مر جائے، یا اس کا کوئی عضو ضائع ہو جائے، ایسے موقع پر حرام کا استعمال جائز ہے" (۱)

حاجت کی تعریف یہ کی گئی ہے:

أن يكون الإنسان فى حالة من الجهد و المشقة التى لا تؤدى به إلى الهلاك و إذا لم يتناول المحرم شرعا»

انسان ایسی حالت میں ہو کہ اگر حرام شرعی کا ارتکاب نہ کرے تو ہلاک نہیں ہو گا، لیکن سخت مشقت ہوگی" (۲)

اس حالت میں حکم فقہاء نے یہ بیان فرمایا ہے کہ:

و ۲۸۵، والحسبۃ لابن قیمیہ ص ۱۷، ۴۱، ورد المحتار، ص ۲۸۲ ج ۵، شرح مسلم للابی ص ۳۰۴ و ۳۰۵ ج ۴، مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے: موسوعۃ الفقہ الاسلامی المصریۃ ص ۱۹۸ و ۱۹۹ ج ۳

(۱) المنثور فی القواعد للزرکشی، ص ۳۱۹ ج ۲۔ والاشباہ والنظائر لابن نجیم، ص ۱۱۹ ج ۱۔

(۲) نظریۃ الضرورۃ الشرعیۃ، ڈاکٹر وہبہ الزحیلی۔ ص ۲۴۷، طبع بیروت، ۱۴۰۲ھ

«هذا لا يبيح الحرام، و يبيح الفطر فی الصوم»

اس حالت میں حرام چیز کا کھانا تو جائز نہیں، لیکن روزہ توڑنا جائز ہو جاتا ہے" (۱)

تیسرا درجہ منفعت ہے، اس کی تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ "یہ ایسی حالت کا نام ہے جس میں ناجائز کام کا ارتکاب نہ کرنے سے نہ تو ہلاکت کا اندیشہ ہے، نہ کوئی شدید مشقت پیش آتی ہے، البتہ وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو ناجائز کام سے بظاہر حاصل ہوتا، فقہاء کرام نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ ایک شخص کے پاس بھوک مٹانے کے لئے جو کی روٹی موجود ہے، لیکن اسے گندم کی روٹی، بکرے کے گوشت اور روغنی کھانے کا شوق ہے، اور جو کی روٹی پسند نہیں، اس درجے سے کسی شرعی حکم میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔ (۲)

چوتھا درجہ زینت ہے، یعنی وہ حالت جس میں ناجائز کام نہ کرنے سے نہ ہلاکت ہوتی ہے، نہ کوئی ناقابل برداشت مشقت پیش آتی ہے، اور ناجائز کے ارتکاب سے کوئی حقیقی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا، البتہ ظاہری سجاوٹ کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے، مثلاً کسی شخص کے پاس بقدر ضرورت کپڑے موجود ہیں، لیکن وہ چاہتا ہے کہ فیشن کے مطابق کپڑے حاصل کرے، اس درجے سے بھی کسی شرعی حکم میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔

پانچواں درجہ فضول ہے، یعنی ایسی حالت میں جس میں ناجائز کے ارتکاب سے نہ ہلاکت کو دور کرنا مقصود ہے، نہ مشقت کو، نہ اس سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اس درجے سے احکام میں کسی تغیر کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

۱۳۵۔ ان پانچ درجات میں سے پہلا درجہ یعنی "ضرورت" ایسا ہے کہ اس کی بنیاد پر بقدر ضرورت حرام کے استعمال کی اجازت ہو جاتی ہے، دوسرا درجہ یعنی "حاجت" ایسا ہے کہ اگرچہ اس سے کسی حرام چیز کے استعمال کا جواز پیدا نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ عمومی شکل اختیار کر جائے، یعنی وہ حاجت انفرادی نہ ہو، بلکہ اجتماعی ہو، تو وہ اجتماعی حاجت بھی بہت سے مسائل میں "ضرورت" کے قائم مقام ہو جاتی ہے، اور اس کی وجہ سے احکام میں تغیر آ جاتا ہے، چنانچہ فقہاء کرام کے ہاں یہ قاعدہ مشہور ہے کہ:

«الحاجة العامة تنزل منزلة الضرورة الخاصة فی حق آحاد الناس»

عمومی حاجت کو اس انفرادی ضرورت کے قائم مقام قرار دیا جا سکتا ہے جو افراد کو

---

(۱) الاشباہ والنظائر ص ۱۱۹ ج ۱۔

(۲) الاشباہ والنظائر ص ۱۱۹ ج ۱۔

پیش آتی ہے۔ (۱)

اس کے علاوہ بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ جو چیز حرام قطعی ہو۔ اس کا جواز صرف "ضرورت" کے حالات میں ہوتا ہے۔ وہاں حاجت کا اعتبار نہیں ہے۔ لیکن جس چیز کی حرمت قطعی نہ ہو۔ بلکہ ظنی ہو۔ وہاں "حاجت" کی بنیاد پر بھی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے۔

۱۳۶۔ اس تفصیل کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ "جبری بیع" کون سی صورتوں میں جائز ہو سکتی ہے؟ حدیث میں "جبری بیع" کا جو ایک موقع بیان کیا گیا ہے۔ یعنی مجاہدین کا راستے کی بستیوں سے جبراً کھانا خریدنا۔ وہ "ضرورت" ہی کی حالت ہے۔ کیونکہ اگر اس کی اجازت نہ ہو تو پورے لشکر کے بھوکے مر جانے کا اندیشہ ہے۔

۱۳۷۔ لیکن فقہاء کرام کے حوالہ سے جبری بیع کی جو صورتیں پیچھے بیان کی گئی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کرام نے "اجتماعی حاجت" کو بھی "ضرورت" کے قائم مقام قرار دے کر "جبری بیع" کی اجازت دی ہے۔ ظاہر ہے کہ مسجد کے تنگ ہونے سے یا راستے کی تنگی سے کسی کی ہلاکت واقع ہونے کا اندیشہ تو ہمیشہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن شدید مشقت ضرور پیش آ سکتی ہے۔ اور چونکہ یہ شدید مشقت اجتماعی نوعیت کی ہے۔ اس لئے فقہاء کرام نے اس حاجت کو ضرورت کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی امیر لشکر مرکز کو پیغام بھیجنے کے لئے کوئی ایلچی روانہ کرنا چاہتا ہے۔ تو ہمیشہ ایسی ضرورت نہیں ہوگی جس کے بغیر لشکر کی ہلاکت کا خطرہ ہو۔ لیکن اس کے بغیر شدید مشقت کا اندیشہ ضرور ہو گا۔ اور یہ مشقت چونکہ اجتماعی نوعیت کی ہے۔ اس لئے اسے بھی "ضرورت" قرار دے کر جبری بیع کی اجازت دی گئی ہے۔

۱۳۸۔ اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا پانچ درجات میں سے "ضرورت" اور "اجتماعی حاجت" دو درجات ایسے ہیں جن کی موجودگی میں "جبری خریداری" کا جواز نکل سکتا ہے۔ لیکن باقی تین درجات یعنی "منفعت" "زینت" یا "فضول" کے لئے جبری خریداری جائز نہ ہو گی۔

۱۳۹۔ اب مذکورہ بحث سے جبری خریداری کے جواز کے لئے ضرورت کا معیار مقرر کرتے ہوئے یہ نتائج بر آمد ہوتے ہیں:

(۱) عام حالات میں کسی شخص کو اس کی ملکیت فروخت کرنے پر مجبور کرنا جائز نہیں۔

(۲) صرف "ضرورت" یا "عمومی حاجت" کے موقع پر ہی جبری خریداری جائز ہو سکتی ہے۔ اور اس کا معیار یہ ہے کہ اس جبری خریداری کے بغیر یا تو کسی کی جان چلی جانے کا براہ راست

---

(۱) المنثور فی القواعد للزرکشی ص ۲۴ ج ۱۔

خطرہ گمان غالب کے درجے میں پیدا ہو گیا ہو. یا اس کے بغیر عام انسانوں کو شدید مشقت میں مبتلا ہونے کا غالب گمان ہو۔

(۳) مذکورہ "ضرورت" یا "عمومی حاجت" کو دور کرنے کا اس جبری خریداری کے سوا کوئی راستہ نہ ہو. اور یہ فیصلہ تمام ممکنہ متبادل طریقوں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد کیا گیا ہو. لہٰذا محض "مفاد عامہ" (Public Interest) کی مجمل بنیاد کافی نہیں، جب تک "ضرورت" یا "عمومی حاجت" کا تیقن نہ ہو گیا ہو۔

(۴) جبری خریداری میں جو چیز زبردستی کسی شخص سے لی جا رہی ہے. اس کا معاوضہ جبری خریداری کی تاریخ میں اس شے کے بازاری نرخ (Markat Value) کے مطابق معین کیا جائے. کیونکہ اوپر بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ شریعت نے جس جگہ جبری خریداری کی اجازت دی ہے. وہاں "قیمت" یا "ضمان" کی ادائیگی لازم قرار دی ہے. اور "قیمت" یا "ضمان" دونوں کا مطلب "بازاری نرخ" کے مطابق ادائیگی ہے. محض کسی حاکم کی طرف سے استبدادی طور پر (Arbitrary) معاوضہ کے تعین کو "قیمت" یا "ضمان" نہیں کہا جا سکتا۔

(۵) بازاری نرخ کے مطابق یہ معاوضہ مطلوبہ شے کا **قبضہ** لینے سے پہلے یا اس کے ساتھ ساتھ ادا کر دیا جائے (البتہ اتنی معمولی تاخیر جو انتظامی طور پر ناگزیر ہو. اور جسے قابل ذکر تاخیر نہ سمجھا جائے. "ساتھ ساتھ" ہی میں داخل سمجھی جا سکتی ہے)

ان شرائط کی مکمل رعایت کے ساتھ حاکم مجاز کو شرعاً یہ اختیار دیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی کی ملکیت جبری طور پر خرید لے۔

غریبوں کی امداد کے لئے املاک کی ضبطی

۱۴۰۔ اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا غریبوں کی امداد کے لئے مال دار افراد کی املاک کا کوئی حصہ جبری طور پر ضبط کیا جا سکتا ہے؟

۱۴۱۔ اس کا جواب مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں یہ ہے کہ جہاں تک بلا معاوضہ ضبطی کا تعلق ہے. وہ صرف ایک انتہائی (Externe) موقع پر بقدر ضرورت جائز ہے. اور وہ انتہائی موقع یہ ہے کہ کوئی شخص شدید بھوک سے واقعۃً بیتاب ہو. یا کسی کو تن ڈھاپنے کے لئے کپڑا میسر نہ ہو. یا شدید موسم کی مدافعت کے لئے اس کے پاس نہ کچھ موجود ہو. نہ حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہو. تو ایسے شخص کی یہ وقتی ضرورت پوری کرنا ہر اس مسلمان پر فرض ہے. جس کے علم میں یہ ضرورت آئی ہو.

اگر کوئی شخص یہ فریضہ ادا نہ کرے، تو اسے بزور حکومت اس کی ادائیگی پر مجبور کرنے کے لئے اس سے ضروریات زندگی یا ان کی قیمت کی رقم کا اتنا حصہ بلا معاوضہ لیا جا سکتا ہے جو مذکورہ شخص کی وقتی ضرورت پوری کر سکے۔ اور مالک کی ناگزیر ضرورت سے زائد ہو۔

۱۴۲۔ اس ایک صورت کے سوا جس کی تفصیل پیچھے بیان ہو چکی ہے، کسی بھی صورت میں اسلامی حکومت کے کسی باشندے سے (مسلم یا غیر مسلم) کی کسی ملکیت پر بلا معاوضہ قبضہ کر لینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔

۱۴۳۔ جہاں تک ایسے اشخاص کا تعلق ہے، جو بھوک پیاس سے بیتاب یا برہنگی کا شکار نہیں ہیں، بلکہ اپنی روز مرہ کی ضروریات، خواہ بہت معمولی انداز میں صرف بقدر ضرورت پوری کر رہے ہیں، لیکن مشقت کے ساتھ پوری کر رہے ہیں، سو ان کا معاشی رتبہ بلند کرنے کے لئے اسلام نے "تحدید ملکیت" یا "املاک کی جبری ضبطی" کا طریقہ اختیار کرنے کے بجائے دوسرے ایسے احکام دیئے ہیں، جن کے ذریعے یہ مقصد حاصل کیا جا سکے، ان احکام میں "زکوٰۃ" کی فرضیت، رشتہ داروں کے نفقے کے احکام، وراثت کے احکام سود، رشوت، قمار وغیرہ کی حرمت وغیرہ سر فہرست ہیں، اگر ان احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا جائے تو وہ زبردست معاشی تفاوت جو معاشرے کے لئے خطرناک ہو سکتا ہے، خود بخود دور ہوتا رہتا ہے، لہٰذا اسلام نے اس غرض کے لئے اس شخص کی املاک کی ضبطی کی اجازت نہیں دی جو زکوٰۃ وغیرہ کے احکام پر عمل پیرا ہو، اور جس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ ناجائز نہ ہو۔

۱۴۴۔ ہاں اگر کسی شخص نے کوئی دولت ناجائز طریقے سے حاصل کی ہے تو اس صورت میں وہ اس کی ملکیت ہی نہیں، لہٰذا اس پوری ناجائز دولت کو اس سے چھین کر اصل مالک کو، اور اگر اصل مالک معلوم نہ ہو سکے، یا اس کو لوٹانا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو تو عام غرباء کو تقسیم کرنا اسلامی حکومت کے لئے نہ صرف جائز، بلکہ ضروری ہے، اس صورت میں ملکیت کی تحدید کا سوال نہیں، بلکہ وہ ناجائز دولت پوری کی پوری واپس لے لی جائے گی۔

۱۴۵۔ البتہ اگر بیجا ارتکاز دولت کے خاتمے کے لئے اسلام نے جو احکام دیئے ہیں، مثلاً زکوٰۃ، عشر، خراج، وراثت اور سود و قمار کی حرمت وغیرہ، اگر ان تمام احکام پر عمل کے باوجود کوئی غیر معمولی صورت حال ایسی پیدا ہو جائے کہ کسی خاص قسم کی دولت کسی خاص طبقے میں سمٹ کر رہ گئی ہو، اور اس کی بنا پر دوسروں کو شدید مشقت اور دشواری کا سامنا ہو تو اس صورت میں اس "عمومی حاجت" کی بنا پر وہ دولت انہی پانچ شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے معاوضہ دے کر اس کے مالکوں سے وصول کی جا سکتی ہے۔

زمینوں کا ارتکاز۔

۱۴۶۔ بعض اوقات یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں زمینوں کے غیر معمولی طور پر بڑے بڑے رقبے چند بڑے بڑے زمینداروں کی ملکیت میں تھے. اور اس طرح زمینوں کا چند ہاتھوں میں ارتکاز ہو کر رہ گیا تھا. اس ارتکاز سے بے شمار معاشی. سیاسی اور معاشرتی مسائل پیدا ہوئے. جنہوں نے معاشرے کو خراب کر کے رکھ دیا. اگر ان بڑے زمینداروں سے زمینیں چھینی نہ جاتیں تو ارتکاز کے اس فتنے کا سدباب کیسے ممکن تھا؟

۱۴۷۔ لیکن اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں دولت کا بیجا ارتکاز صرف زمینوں کے ساتھ مخصوص نہیں. بلکہ دولت کے ہر شعبے میں موجود ہے. لیکن اس کی وجہ اسلامی احکام سے روگردانی ہے. دوسرے شعبوں کی طرح زمینوں میں بھی یہ بیجا ارتکاز اس بنا پر نہیں ہوا کہ ملکیت زمین کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تھی. اور نہ اس کا علاج یہ تھا کہ ملکیت کی ایک حد مقرر کر کے باقی تمام زمینیں چھین لی جائیں. بلکہ درحقیقت اس ارتکاز کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان زمینوں کے معاملے میں شرعی احکام پر عمل نہیں ہوا. مثلاً زمینوں کے تعلق سے انتہائی افسوس ناک بات یہ رہی ہے کہ ان زمینوں میں سالہا سال سے شرعی احکام کے مطابق وراثت جاری رہتی تو ہرگز ممکن نہیں تھا کہ اتنے بڑے بڑے رقبے چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائیں۔

۱۴۸۔ اسی طرح زمینوں کی ملکیت کے حصول میں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی کوئی تفریق روا نہیں رکھی گئی. چنانچہ بہت سی زمینیں حرام طریقوں سے حاصل ہوئیں. لیکن ان کی قانونی ملکیت تسلیم کی گئی۔

۱۴۹۔ ہماری نظر میں موجودہ زمینداری نظام میں جو خرابیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں ان کا حل اس طرح کی "تحدید ملکیت" نہیں ہے. جس کے ذریعے گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے ملکیت کی حد مقرر کر دی جائے. جسکی واضح اور ناقابل انکار دلیل یہ ہے کہ "زرعی اصلاحات" کے نام سے ملک میں کئی بار یہ تحدید مقرر کی گئیں. ان میں سے آخری تحدید جو ۱۹۷۷ء کے ایکٹ نمبر ۲ کے ذریعے کی گئی تھی. اس کو بھی اب دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے. لیکن ان بار بار کی تحدیدات کے باوجود موجودہ زمینداری نظام کی مذکورہ خرابیاں بھی جوں کی توں باقی رہیں. اور زمینوں کے ارتکاز کے مفاسد کا بھی کوئی مؤثر سدباب نہیں ہو سکا۔ اس طرح کی تحدیدات ہمیشہ چور دروازوں کا راستہ کھلا رکھتی ہیں. اور ان کی بنا پر مطلوبہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے۔

۱۵۰۔ درحقیقت ان خرابیوں کے انسداد کے لئے اسلام نے ایسے احکام دیئے ہیں جن کے ذریعے بالواسطہ طور پر (Indirectly) خود بخود املاک میں تحدید ہوتی رہتی ہے. اور چند ہاتھوں

میں زمینوں کے بیجا ارتکاز کا کوئی راستہ برقرار نہیں رہتا۔ ان احکام میں سے مندرجہ ذیل بطور خاص قابل ذکر ہیں:

(۱) شرعی وراثت کے احکام پر پوری طرح عمل کیا جائے، اور ان احکام کو مئوثر بہ ماضی (Retrospective)قرار دیا جائے، کیونکہ جس کسی شخص نے کسی دوسرے وراث کا حق پامال کر کے اس پر قبضہ کیا ہے، اس کی ملکیت ناجائز ہے، اور وہ ہمیشہ ناجائز ہی رہے گی، جب تک اسے اصل مالک کو نہ لوٹایا جائے۔

(۲) جن لوگوں نے کسی ایسے طریقے سے کسی زمین کی قانونی ملکیت حاصل کی ہے جو شریعت میں حرام ہے، مثلاً رشوت وغیرہ، ان سے وہ زمینیں واپس لے کر اصل مالکوں کو لوٹائی جائیں، اور اگر اصل مالک معلوم نہ ہوں، یا قابل دریافت (treceable) نہ ہوں تو غریبوں میں تقسیم کی جائیں، اس غرض کے لئے ایک کمیشن قائم کیا جا سکتا ہے، جو اراضی کی تحقیق کر کے اس پر عمل کرے۔

(۳) اس فیصلے کے شروع میں وہ احادیث ذکر کی جا چکی ہیں جن میں یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ غیر مملوک بنجر زمین کو جو شخص بھی آباد کر لے، وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے، امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک اس طرح آباد کرنے کے لئے حکومت کی اجازت ضروری ہے، اس اصول کے تحت نئی آبادی کے وقت ایسے لوگوں کو ترجیح دی جائے جن کے پاس پہلے سے زمین نہیں ہے، یا بہت کم ہے۔

(۴) پھر غیر مملوک بنجر زمینوں کی آباد کاری کے تحت اگر کسی زمیندار نے خود یا اپنی تنخواہ دار مزدور کے ذریعے زمین آباد کی ہے، تب تو وہ اس کا مالک ہے، لیکن اگر اس نے آبادی ہی کاشتکاروں کے ذریعہ کروائی ہے تو پھر آباد شدہ زمین کا مالک انہی کاشت کاروں کو قرار دیا جا سکتا ہے جنہوں نے وہ زمین خود آباد کی۔

(۵) بہت سی زمینیں لوگوں نے سودی رہن کے طور پر قبضے میں لی تھیں، اور رفتہ رفتہ وہ ان زمینوں کے مالک بن بیٹھے۔ یہ ملکیت بھی شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے، یہ زمینیں ان کے اصل مالکوں کی طرف واپس کی جائیں، اور اس دوران ان زمینوں سے رہن رکھنے والوں نے جو فائدہ اٹھایا ہے، اس کا کرایہ اصل قرض میں محسوب کیا جائے، اور قرض میں محسوب ہونے کے بعد زمینیں ان کے تصرف میں رہی ہوں تو اس سے زائد مدت کا کرایہ اصل مالکوں کو دلوایا جا سکتا ہے۔

(۶) مزارعت (بٹائی) کے معاملات میں جو ظلم وستم زمینداروں کی طرف سے کسانوں پر

ہوتے ہیں، ان کی وجہ وہ فاسد شرطیں ہیں جو زمیندار کسانوں کی بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر ان پر قولی یا عملی طور پر عائد کر دیتے ہیں، اور جو اسلام کی رو سے قطعی ناجائز اور حرام ہیں، اور ان میں سے بہت سی بیگار کے حکم میں آتی ہیں، ایسی تمام شرائط کو، خواہ وہ زبانی طے کی جاتی ہوں، یا رسم و رواج کے ذریعے ان پر عمل چلا آتا ہو، قانوناً ممنوع قرار دے کر قانون کی سختی سے پابندی کرائی جائے۔

(۷) اسلامی حکومت کو یہ بھی اختیار ہے کہ اگر زمینداروں کے بارے میں یہ احساس ہو کہ وہ کاشتکاروں کی مجبوری کی وجہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان سے بٹائی کی شرح اتنی مقرر کرتے ہیں جو کاشتکار کے ساتھ انصاف پر مبنی نہیں ہوتی، تو وہ بٹائی کی کم از کم شرح قانونی طور پر مقرر کر سکتی ہے، جس کے ذریعے کاشت کار کو اس کی محنت کا پورا صلہ مل جائے، اور معاشی تفاوت میں کمی واقع ہو۔

(۸) مزارعت کے نظام میں جو موجودہ خرابیاں پائی جاتی ہیں، اگر مذکورہ بالا طریقوں سے ان پر پوری طرح قابو پانا ممکن نہ ہو تو اسلامی حکومت کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ ایک عبوری دور کے لئے یہ اعلان کر دے کہ اب زمینیں بٹائی پر نہیں دی جائیں گی، بلکہ کاشت کار مقررہ اجرت پر زمیندار کے لئے بحیثیت مزدور کام کریں گے، اس اجرت کی تعیین بھی حکومت کر سکتی ہے، اور بڑی بڑی زمینوں کے مالکان پر یہ شرائط بھی عائد کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک عبوری دور تک زمین کا کچھ حصہ سالانہ اجرت میں مزدور کاشتکار کو دیں گے۔

(۹) پیداوار کی فروخت کے موجودہ نظام میں یہ فروختگی اتنے واسطوں سے ہو کر گزرتی ہے کہ ہر درمیانی مرحلے پر قیمت کا حصہ تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے، آڑھتیوں، دلالوں اور دوسرے درمیانی اشخاص (Middle Men) کی بہتات سے جو نقصانات ہوتے ہیں، وہ ظاہر ہیں، اسی لئے اسلام میں ان درمیانی واسطوں کو پسند نہیں کیا گیا، ان واسطوں کو ختم یا کم کرنے کے لئے یا تو ایسے منظم بازار قائم کئے جائیں جن میں دیہی کاشتکار خود پیداوار فروخت کر سکیں، یا امداد باہمی کی ایسی انجمنیں قائم کی جائیں جو خود کاشت کاروں پر مشتمل ہوں، اور وہ فروختگی کا کام انجام دیں، تاکہ قیمت کا جو بڑا حصہ درمیانی اشخاص کے پاس چلا جاتا ہے، اس سے کاشتکار اور عام صارفین فائدہ اٹھا سکیں۔

اگر زرعی اصلاحات ان خطوط پر کی جائیں تو نہ صرف یہ کہ یہ اقدامات شریعت کے عین تقاضے کے مطابق ہوں گے، بلکہ ان سے وہ خرابیاں بھی پیدا نہیں ہوں گی جو کمیاتی تحدید ملکیت کے ذریعے پیدا ہوتی ہیں۔

چونکہ زمینوں کے بیجا ارتکاز کے سدباب کے لئے مذکورہ بالا طریقے موجود ہیں، اور انہیں کام میں نہیں لایا گیا، اس لئے معاوضہ دے کر جبری خریداری کی جو شرائط اوپر بیان کی گئی ہیں وہ بھی یہاں پوری نہیں ہوئیں۔

وقف کا مسئلہ۔

۱۵۱۔ اور جب یہ دفعات ذاتی ملکیتوں کے حق میں قرآن و سنت سے متصادم ہیں، تو وقف کے حق میں بدرجہ اولی قرآن و سنت سے متصادم ہیں، کیونکہ وقف کی بیع باہمی رضامندی سے بھی جائز نہیں ہوتی۔ (الا یہ کہ واقف نے وقف کرتے وقت شرائط وقف میں یہ شرط لگا دی ہو کہ مخصوص حالات میں وقف کی مصلحت کی خاطر یا کسی ناگزیر ضرورت سے وقف جائداد کو بیچ کر اس کی رقم سے کوئی دوسری جائداد خرید لی جائے گی، اور اس کو پہلے وقف کے مقاصد کے لئے وقف سمجھا جائے گا) اس سلسلے میں وفاقی شرعی عدالت کے اقلیتی فیصلے میں (جو جسٹس کریم اللہ درانی مرحوم نے لکھا ہے) جو دلائل دیئے گئے ہیں، وہ کافی وشافی ہیں، اکثریتی فیصلے میں اگرچہ وقف کی زمین کو بھی مفاد عامہ کے تحت بلا معاوضہ یا بالمعاوضہ زبردستی لے لینے کو جائز قرار دیا گیا ہے، لیکن اس معاملے میں انہوں نے قرآن و سنت کی کوئی دلیل پیش نہیں کی، اس کے بجائے صرف یہ کہہ دیا ہے کہ اگر کسی وقف زمین کی جگہ کوئی ڈیم بنانا پڑے تو کیا حکومت کو یہ اختیار نہیں ہو گا کہ وہ ڈیم کے لئے اس وقف زمین کو لے لے؟

۱۵۲۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈیم کی جس ضرورت کا ذکر فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں کیا گیا ہے، اس سے وقف کو بلا معاوضہ لے لینے کا جواز تو کسی طرح ثابت نہیں ہوتا، بلکہ جبری خریداری کا جواز بھی نہیں نکلتا، کیونکہ ایسی شدید اور ناگزیر ضرورت کی صورت میں "وقف" ہی کے احکام میں "استبدال" کا ایک مفصل باب موجود ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایسی ناگزیر ضرورت کے موقع پر اس وقت زمین کی ہم پلہ اور ہم مقدار زمین کسی اور جگہ اسی وقف کے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے دے دی جاتی ہے، جس سے وقف کا مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے، اور مذکورہ ضرورت بھی پوری ہو جاتی ہے، یا وقف جائداد کو معقول معاوضے پر بیچ کر اس کی رقم سے دوسری جائداد خرید لی جاتی ہے، اس کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں، جن کے بغیر یہ "استبدال" جائز نہیں، جن کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (رد المحتار، کتاب الوقف، ص ۳۸۴ ج ۴، مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی) لیکن چونکہ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے، اس لئے یہاں ان کی تفصیل

بیان کرنا غیر ضروری ہے یہ بات بہرحال متعین ہے کہ زیر بحث قوانین میں جس طرح اوقاف کو قبضے میں لینے کی اجازت دی گئی ہے. اس کا "استبدال" اور اس کی شرائط سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

زمینوں کی تقسیم اور بیع پر پابندی

۱۵۳۔ اب میں شریعت اپیل نمبر ۴ ۔ در ۔ ۱۹۸۱ء کی طرف آتا ہوں. اس اپیل میں لینڈ ریفارمز ریگولیشن (ایم ایل آر ۱۱۵) ۱۹۷۲ء کے پیراگراف نمبر ۲۲، ۲۴ اور ۲۵ کے بعض احکام کو چیلنج کیا گیا ہے۔

مذکورہ ریگولیشن کے پیراگراف نمبر ۲۲ کے احکام یہ ہیں:

(۱) ایسی مشترک ملکیت کی زمین (Joint holding) جو گزارے کی مقدار (subsistence holding) کے برابر یا اس سے کم ہو، اس کو کسی بھی حال میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔

(۲) ایسی مشترک ملکیت کی زمین جو گزارے کی مقدار سے زیادہ ہو، لیکن کفایتی مقدار (Ecenomic Holding) سے کم ہو، اس کو اس طرح تقسیم نہیں کیا جائے گا کہ تقسیم کے نتیجے میں کسی شریک کی کل ملکیت اس کی پہلے سے مملوک زمین کو شامل کر کے گزارے کی مقدار سے کم رہ جائے؟

(۳) ایسی مشترکہ ملکیت کی زمین جو کفایتی مقدار کے برابر ہو، کسی بھی حالت میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔

(۴) ایسی مشترک ملکیت کی زمین جو کفایتی مقدار سے زائد ہو، اس طرح تقسیم نہیں کی جائے گی کہ تقسیم کے نتیجے میں کسی بھی شریک کی کل ملکیت اس کے پہلے سے مملوکہ زمین کو شامل کر کے کفایتی مقدار کے برابر نہ رہے، یا کسی ایک شریک کی ملکیت گزارے کی مقدار سے کم رہ جائے۔

(۵) اس پیراگراف کے مذکورہ بالا احکام کی خلاف ورزی میں جو تقسیم کی جائے گی وہ کالعدم ہو گی۔

۱۵۴۔ اپیل کنندہ کو اس پیراگراف پر اعتراض یہ ہے کہ یہ قوانین انفرادی ملکیت کے حقوق میں ایسی مداخلت کر رہے ہیں جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اپیل کنندہ نے ان قوانین کے خلاف قرآن کریم کی ان آیات سے استدلال کیا ہے جن میں کسی کے انتقال پر اس کی املاک اس کے

وارثوں کے درمیان تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اپیل کنندہ کا موقف یہ ہے کہ کسی زمین کے ہر وارث یا ہر شریک کو شرعاً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا حصہ دوسرے شرکاء سے ممتاز اور الگ کر کے وصول کرنے کا مطالبہ کرے۔ مذکورہ بالا قانون اس کا حق تلف کر رہا ہے۔ لہٰذا وہ قابل تنسیخ ہے۔

۱۵۵۔ اس کے مقابلے میں فاضل وفاقی شرعی عدالت نے اپنے فیصلے میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حکومت نے یہ قانون مصلحت عامہ کے تحت بنایا ہے۔ جدید معاشی تحقیق سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ زرعی زمینوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کاشت کرنے سے مجموعی پیداوار میں کمی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا پاکستان جیسے ملک میں جہاں پیداوار بڑھانے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ اگر زمینوں کی تقسیم پر پابندی عائد کر دی جائے تو اس سے قرآن و سنت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

۱۵۶۔ میں نے اس مسئلہ پر تفصیل سے غور کیا، اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس معاملے میں وفاقی شرعی عدالت کا موقف وزن رکھتا ہے۔ اسی فیصلے کے پیراگراف نمبر ۴۸ سے ۵۵ تک میں اس مسئلے پر بحث کر چکا ہوں کہ مباحات کے دائرے میں حکومت کو مصالح عامہ کی خاطر ایسے احکام جاری کرنے کا حق حاصل ہے۔ جن میں کسی کی ملکیت چھینے بغیر اس کے استعمال کے طریقے پر کوئی پابندی عائد کر دی گئی ہو، بشرطیکہ اس پابندی سے قرآن و سنت کے کسی حکم کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔

۱۵۷۔ اپیل کنندہ نے میراث کی جن آیات سے استدلال کیا ہے، ان سے اپیل کنندہ کا موقف ثابت نہیں ہوتا، اس لئے کہ ان آیات سے جو بات ثابت ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کے ترکے کی ملکیت اس کے ورثاء کی طرف بحصّہ رسدی منتقل ہو جائے گی، لیکن ورثا کی ملکیت ثابت ہونے کے بعد وہ آپس میں تصفیہ کس طرح کریں؟ اس کا کوئی مخصوص طریقہ ان آیات کریمہ میں متعین کرنے کے بعد ورثاء یہ چاہیں کہ اس جائیداد کو تقسیم کرنے کے بجائے اس کو مشترک حیثیت ہی میں باقی رکھیں، اور اس سے بحصّہ رسدی فائدہ اٹھاتے رہیں، تو مذکورہ آیات میں اس کی ممانعت نہیں ہے۔

۱۵۸۔ اسی طرح اگر کوئی مشترک جائیداد اسی نوعیت کی ہو کہ اس کے حصے بخرے کرنے کے بعد وہ بیکار ہو جائے، شرکا کے لئے قابل انتفاع نہ رہے، یا کسی ایک شریک کا حصہ اتنا کم رہ جائے کہ وہ اس سے کما حقہ فائدہ نہ اٹھا سکے تو ان تمام صورتوں میں بھی مشترک جائیداد کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

۱۵۹۔ ان مسائل پر تقریباً تمام فقہاء متفق ہیں، مثلاً علامہ کاسانی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

«فإن كان فى فى تبعيضه ضرر بكل واحد منهما فلا تجوز قسمة الجبر فيه. وذلك نحو اللؤ لؤة الواحدة .... و الخيمة و الحائط و الحمام و البيت الصغير و الحانوت الصغير.

اگر مشترکہ جائیداد کے حصے کرنے سے دونوں شریکوں کو نقصان پہنچتا ہو تو اس میں جبری تقسیم نہیں ہو سکتی، مثلاً ایک موتی ...... خیمہ، دیوار، حمام، چھوٹا گھر اور چھوٹی دکان۔ (۱)

۱۶۰۔ عام طور پر حنفی فقہاء نے تقسیم نہ کرنے کے اس حکم کو اس صورت کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، جب تقسیم کے بعد کوئی شریک اپنے حصے سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکے، جو تقسیم سے پہلے اٹھا رہا تھا، لیکن امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ اس صورت کو بھی داخل قرار دیتے ہیں جب کہ تقسیم کے بعد کسی شخص کے حصے کی قیمت پہلے سے کم ہو جائے، علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

«و عن أحمد رواية أخرى. أن المانع هو أن تنقص قيمة نصيب أحدهما بالقسمة عن حال الشركة، سواء انتفعوا به مقسوماً أو لم ينتفعوا و قال القاضي: هذا ظاهر كلام أحمد. لأنه قال فى رواية الميمونى: إذا قال بعضهم: يقسم و بعضهم: لا تقسم، فإن كان فيه نقصان من ثمنه بيع و أعطوا الثمن. فاعتبر نقصان الثمن و هذا ظاهر كلام الشافعي. لأن نقص قيمته ضرر و الضرر منفي شرعاً.

امام احمد سے ایک روایت اور ہے، اور وہ یہ کہ یہ بات بھی تقسیم سے مانع ہے کہ کسی شریک کے حصے کی قیمت تقسیم کی بنا پر اس قیمت سے کم ہو جائے جو شرکت کی حالت میں تھی، خواہ وہ تقسیم کے بعد اس سے نفع اٹھا سکیں یا نہیں اٹھا سکیں۔ قاضی کہتے ہیں کہ: امام احمد کا ظاہر موقف یہی ہے، اس لئے کہ انہوں نے میمونی کی روایت

---

(۱) بدائع الصنائع۔ ص ۱۹ ج ۷۔

میں کہا ہے کہ اگر کچھ شریک تقسیم کرنے کو کہیں، اور کچھ شریک تقسیم سے انکار کریں تو اگر تقسیم سے قیمت میں کمی آتی ہو تو (اسے تقسیم نہیں کیا جائے گا، بلکہ) اسے بیچ کر ہر شریک کو اس کی قیمت دے دی جائے گی، اس مسئلہ میں امام احمد نے قیمت کی کمی کا بھی اعتبار کیا ہے اور امام شافعی کا ظاہر موقف بھی یہی ہے، کیونکہ قیمت میں کمی ایک ضرر ہے، اور شرعاً ضرر کو دور کرنا چاہئے۔ (۱)

بلکہ آگے چل کر علامہ ابن قدامہ کا یہ عام مقولہ نقل کرتے ہیں کہ:

كل قسمة فيها ضرر لا أرى قسمتها، وهذا قول ابن أبي ليلى و أبي ثور.

ہر وہ تقسیم جس میں کوئی ضرر (نقصان) ہو، میں اس کا قائل نہیں ہوں، اور ابن ابی لیلی اور ابو ثور کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے۔ (۲)

فقہاء کرام نے ضرر کی وجہ سے تقسیم کو جو منع فرمایا ہے، اس کی بنیاد ایک حدیث پر ہے:

عن عمرو بن جميع عن النبي ﷺ أنه قال: لا تعضية على أهل الميراث إلا ما حمل القسم.

اہل میراث پر مال کو تقسیم کرنا واجب نہیں ہے، الا یہ کہ وہ مال ایسا ہو جو تقسیم کا احتمال رکھتا ہو۔ (۴)

اس حدیث کی تشریح میں امام ابو عبیدہ فرماتے ہیں:

هو أن يخلف شيئا إذا قسم كان فيه ضرر على بعضهم أو عليهم جميعاً.

یہ حدیث اس صورت سے متعلق ہے جب کوئی شخص ایسی چیز چھوڑ کر مرے کہ اگر اسے تقسیم کیا جائے تو اس تقسیم سے بعض ورثاء کو یا سب کو ضرر (نقصان) پہنچے۔

---

(۱) المغنی لابن قدامہ۔ ص ۴۹۴ ج ۱۱۔

(۲) المغنی لابن قدامہ۔ ص ۴۹۴۔ ج ۱۱۔

(۳) علامہ عظیم آبادی نے اس حدیث کے ایک راوی صدیق بن موسیٰ پر اعتراض کیا ہے۔ لیکن امام ابن حبان انہیں ثقات میں شمار کرتے ہیں، ابن عیینہ ان کی تعریف کرتے ہیں۔ اور ابن حاتم ان پر کوئی جرح نہیں کرتے۔ (لسان المیزان ص ۱۸۹ ج ۳۔)

(۴) سنن الدارقطنی۔ ص ۲۱۹ ج ۴۔ و کنز العمال، ص ۵ ج ۱۱، فرائض نمبر ۳۳۔

(المغنی لابن قدامہ ص۴۹۵ ج۱۱)

اور علامہ زمخشری اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

هي التفريق، من عضت الشاة، أي إذا كان في التركة ما يستضر الورثة بقسمة كحبة الجوهر، و الطيلسان، و الحمام، ونحوها لم يقسم، ولكن ثمنه.

"تعضیہ" تقسیم کو کہتے ہیں، بکری کے حصے بخرے کرنے کو تعضیہ کہتے ہیں، اور یہ لفظ اسی سے نکلا ہے، اور حدیث کا مطلب یہ کہ اگر ترکے میں کوئی چیز ایسی ہو جس کی تقسیم سے ورثاء کو ضرر پہنچے، مثلاً کسی جوہر کا ایک دانہ، یا چادر یا حمام وغیرہ تو اسے تقسیم نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کی قیمت کا اعتبار ہو گا۔

(الفائق للزمخشری ص۱۶۲ ج۲)

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر تقسیم سے شرکاء یا کسی ایک شریک کو نقصان پہنچنے کا احتمال غالب ہو تو اس صورت میں کسی جائیداد کو تقسیم نہ کرنا میراث کے احکام کے منافی نہیں ہے، بشرطیکہ ہر شریک کا حصہ ملکیت محفوظ رہے، اور کسی شخص کو اپنے مملوک سے محروم نہ ہونا پڑے۔

۱۶۱۔ اس میں شک نہیں کہ فقہاء کرام نے تقسیم کے جو موانع بیان کئے ہیں، وہ زیادہ تر انفرادی ضرر سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی ان میں تقسیم کا نقصان کسی ایک شریک یا تمام شرکاء کو پہنچتا ہے، اور اجتماعی ضرر سے انہوں نے بحث نہیں فرمائی، لیکن جب یہ اصول مان لیا جائے کہ "ضرر" کی بنیاد پر تقسیم کو چھوڑا جا سکتا ہے، تو اس میں اجتماعی ضرر بھی خود بخود داخل ہو جاتا ہے۔

۱۶۲۔ لہٰذا اگر تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں ملک کی مجموعی پیداوار متاثر ہو رہی ہو، اور اس سے پورے ملک کی معاشی حالت "ضرر" کا شکار ہو سکتی ہو تو ایسی صورت میں اگر حکومت کسی معقول حد سے زائد تقسیم پر پابندی عائد کر دے، تو مذکورہ بالا اصول کے تحت بظاہر اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اور ایسی پابندی کو قرآن و سنت کے احکام سے متصادم کہنا بظاہر مشکل ہے، لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ کفایتی مقدار یا گزارے کی مقدار کی زمین کو مزید تقسیم کرنے سے واقعۃً "ضرر" لاحق ہوتا ہے یا نہیں؟ اور یہ ضرر کس درجے کا ہے؟ اس موضوع پر ہمیں ان اپیلوں کی سماعت کے دوران خاطر خواہ معاونت نہیں مل سکی، اس لئے فی الحال اس حصے کے حتمی فیصلے کو موخر کیا جاتا ہے۔

۱۶۳۔ مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کے پیراگراف نمبر ۲۴ کی مختلف شقوں کے احکام کا خلاصہ یہ

کہ زمین کا کوئی بھی ایسا انتقال (خواہ بیع کے ذریعے ہو یا ہبہ کے ذریعے) قانوناً ممنوع ہو گا، جس کے نتیجے میں کسی ایک شخص کی مقبوضہ زمین کفایتی مقدار (Economic Holding) سے کم رہ جائے، یا اگر وہ پہلے ہی کفایتی مقدار سے کم ہو تو گزارے کی مقدار (Subsistemce Holding) سے کم رہ جائے۔

اپیل کنندہ نے اس پیراگراف کو بھی اسی بنیاد پر چیلنج کیا ہے کہ یہ حقوق ملکیت میں حکومت کی بیجا مداخلت ہے، جو قرآن و سنت کے احکام کے خلاف ہے۔

۱۶۴۔ دراصل اس پیراگراف کے احکام کا مقصد بھی وہی ہے جو تقسیم پر پابندی عائد کرنا مقصود معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ اسی پیراگراف میں یہ صراحت موجود ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زمین فروخت کرنا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے، تاہم اس کا لازمی تقاضہ یہ بھی ہونا چاہئے کہ اگر کوئی شخص اپنی زمین کے کسی حصے کی بیع اس طرح کرنا چاہے کہ خریدار اور وہ زمین کے مشترک مالک بن جائیں، اور زمین الگ الگ تقسیم نہ ہو تو اس پر بھی کوئی پابندی نہ ہو، لیکن اس پیراگراف کے تحت قانوناً جائز نہیں ہو گی، جس سے زمین بائع اور خریدار کے درمیان تقسیم ہوئے بغیر مشترک ہو جائے، جس کو اسلامی فقہ میں مشاع کہا جاتا ہے، اور یہ بات بالکل درست ہے کہ اس قسم کی بیع پر پابندی عائد کرنے کا جواز نہیں ہے، اس لئے کہ زمینوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹنے کی جس خرابی کا انسداد مقصود ہے، وہ اس صورت میں پیدا نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ میراث کے احکام کے ذریعے ایک چھوٹی سے چھوٹی زمین میں بھی مزید حصہ دار پیدا ہو سکتے ہیں، اور ان مزید حصہ داروں کے شریک ہونے میں زیر نظر قانون کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا، تاوقتیکہ زمین ان کی مشترک ملکیت رہے، لہٰذا اگر زمین کی فروخت کے نتیجے میں مزید حصہ دار پیدا ہو جائیں، تو اس میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہئے، تاوقتیکہ بیچنے والا اور خریدار دونوں زمین کے مشترک مالک رہیں، اور آپس میں اسے تقسیم نہ کریں۔

۱۶۵۔ اگر ایک چھوٹی زمین کے مالک کو اپنے لئے کچھ رقم کی ضرورت ہے، اور وہ اپنی پوری زمین اس لئے بیچنا نہیں چاہتا کہ اس طرح وہ اپنے ذریعہ معاش سے محروم ہو جائے گا، اور اپنی وہ ضرورت زمین کا ایک حصہ بیچ کر پوری کر سکتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ایسا کرنے سے روکا

لیکن امام ابن حبان انہیں ثقات میں شمار کرتے ہیں، ابن عیینہ ان کی تعریف کرتے ہیں، اور ابن ابی حاتم ان پر کوئی جرح نہیں کرتے۔

(لسان المیزان ص۱۸۹ ج ۳)

جائے، قرآن و سنت کی رو سے مالک کو اپنی ہر ملکیت کلی یا جزوی دونوں طریقے سے بیچنے کا پورا اختیار ہے، لہٰذا پیراگراف کا وہ حصہ جو ایسی بیع سے منع کرتا ہو، بظاہر قرآن و سنت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

۱۶۶۔ لیکن ریگولیشن کے پیراگراف نمبر ۲۲ میں تقسیم پر جو پابندی عائد کی گئی ہے، اس کے معاملے میں حتمی فیصلے کو فی الحال ملتوی رکھا گیا ہے، اور اس پیراگراف کا اس مسئلے سے گہرا تعلق ہے، نیز اس سلسلے میں وفاقی شرعی عدالت کا ایک اور تازہ فیصلہ حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے، مناسب ہے کہ اس پر بھی غور کر لیا جائے، اس لئے اس نکتے پر بھی حتمی فیصلے کو موخر رکھا جاتا ہے۔

مزارعت ختم کرنے پر پابندی

۱۶۷۔ اپیل کنندہ نے مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کے پیراگراف ۲۵ کو بھی چیلنج کیا ہے، اس پیرا گراف میں کہا گیا ہے کہ کوئی مالک زمین کسی مزارع یا کرایہ دار سے زمین خالی نہیں کرا سکتا، الایہ کہ وہ مزارعت کی شرائط کے مطابق کرایہ ادا نہ کرتا ہو، یا زمین کو اس انداز میں استعمال کرتا ہو، جس سے اس کا مقصد فوت ہو جائے، یا اس ریگولیشن کے مطابق اس پر کوئی سزا عائد ہو گئی ہو، یا وہ زمین کو طے شدہ یا رواجی شرائط کے مطابق کاشت نہ کر سکتا ہو، یا اس نے زمین کسی اور کو ذیلی مزارعت پر دیدی ہو۔

۱۶۸۔ اپیل کنندہ کا اعتراض یہ ہے کہ مالک زمین اور مزارع کے درمیان جب کوئی معاہدہ ہو جائے تو اس معاہدہ کے مطابق مالک کو انخلاء کا حق ہونا چاہئے، اور یہ حکم دے دینا کہ جب کسی زمین میں کوئی مزارع ایک مرتبہ کام شروع کر دے تو مالک اس کے ساتھ مزارعت کے معاملے کو کسی بھی حال میں ختم نہ کر سکے، یہ حقوق ملکیت میں ایسی دخل اندازی ہے جو شریعت کے خلاف ہے۔

۱۶۹۔ میں اس فیصلے کے پیراگراف ۱۰ سے پیراگراف ۳۰ تک قرآن و سنت کے وہ دلائل ذکر کر چکا ہوں جن کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملکیت کے معاملے میں زمین اور دوسری اشیاء کے درمیان کوئی فرق نہیں، اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ زمین شخصی ملکیت میں آ سکتی ہے، تو اس کا منطقی نتیجہ یہی ہے کہ کوئی دوسرا شخص اگر اسے استعمال کرے تو وہ مالک کے ساتھ کسی معاہدے کے تحت ہی ہونا چاہئے، چنانچہ مزارعت یا کرایہ دونوں وہ جائز عقود اور معاہدات (Centract) ہیں، جن کے تحت کوئی شخص کسی دوسرے کی زمین جائز طور پر استعمال کر سکتا ہے، اور معاہدات کے بارے میں قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے:

یا أیہا الذین آمنوا أوفوا بالعقود

اے ایمان والو! معاہدات کو پورا کرو۔ (۱)

نیز ارشاد ہے:

وأوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولاً

عہد کو پورا کرو، بلاشبہ عہد کے بارے میں (آخرت میں) سوال ہو گا۔ (۱)

کیونکہ مزارعت بھی ایک معاہدہ ہے، لہٰذا ان آیات کی روشنی میں اس کا شرائط معاہدہ کے تابع ہونا ضروری ہو گا، چنانچہ اگر مزارعت کے وقت اس معاہدہ کے جاری رہنے کے لئے فریقین کے درمیان کوئی مدت طے کر لی گئی ہو، تو اس مدت کے ختم ہونے پر معاہدہ کا ختم ہو جانا مذکورہ آیتوں کا لازمی تقاضہ ہے، جب کہ زیر نظر قانون اس کے برخلاف یہ حکم دیتا ہے کہ فریقین کے درمیان خواہ کوئی مدت مقرر ہوئی ہو، مزارعت کا معاہدہ مالک زمین کی طرف سے اس وقت تک ختم نہیں کیا جا سکتا جب تک ان پانچ حالتوں میں سے کوئی حالت نہ پائی جائے جو ریگولیشن کے پیراگراف نمبر ۲۵ میں مذکور ہیں۔

۱۷۰۔ قرآن کریم کے بعد اگر احادیث کو دیکھا جائے تو ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مزارعت ایک معاہدہ ہے، اور اس کی مدت (Tenure) معاہدے کے شروع میں فریقین کی رضامندی سے طے کی جائے گی، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں سے مزارعت کا جو معاملہ فرمایا تھا، اس میں یہ صراحت موجود تھی کہ ان کو مزارعت پر اس وقت تک باقی رکھا جائے گا جب تک ہم چاہیں، چنانچہ صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے یہ معاملہ کرتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

نقركم على ذالك ما شئنا

ہم آپ لوگوں کو زمین پر اس وقت تک باقی رکھیں گے جب تک ہم چاہیں گے۔ (۲)

علامہ نووی رحمتہ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا خلاصہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ صرف

---

(۱) سورۃ مائدہ۔ آیت ۱۔

(۱) سورۃ بنی اسرائیل۔ آیت ۳۴۔

(۲) صحیح مسلم، باب المساقات۔

ایک سال کا معاہدہ ہوا تھا، اور ہر سال اس معاہدے کی تجدید کی جاتی تھی۔ (۱)
اسی معاہدے کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو انہوں نے یہودیوں سے وہ زمینیں واپس لے لیں، اور اس موقع پر ایک خطبے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

یا أیہا الناس ! إن رسول اللہ ﷺ کان عامل یہود خیبر علی إنا نخرجھم إذا شئنا۔ فمن کان لہ مال فلیلحق بہ، و إنی مخرج الیہود۔ فأخرجھم۔

سنن ابو داؤد کے مطبوعہ اردو ترجمے میں یہ حدیث نمبر ۲۸۰۱ ہے، اور اس کا ترجمہ مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے:

> اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں سے یہ معاملہ طے کیا تھا کہ جب چاہیں گے ہم ان کو نکال دیں گے، لہٰذا جس شخص کا جو مال ان کے پاس ہو وہ ان سے اپنا مال لے لے، کیونکہ میں یہودیوں کو نکالنے ہی والا ہوں۔

اس واقعہ سے یہ بات واضح ہے کہ مزارعت کا معاملہ معاہدے کی شرائط کے تابع ہوتا ہے، اور معاملے کے وقت جو شرائط طے کر لی گئی ہوں، فریقین پر اس کی پابندی لازم ہے۔ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں مزارعت کے معاملے کا عام رواج تھا، یہاں تک کہ حضرت ابو جعفر محمد باقر رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

«ما بالمدینة أھل بیت ھجرة إلا یعطون أرضھم بالثلث و الربع .

> مدینہ میں مہاجرین کا کوئی گھرانہ ایسا نہیں تھا جو اپنی زمین تھائی یا چوتھائی کی بٹائی پر نہ دیتا ہو۔ (۱)

ان تمام معاملات میں یہ بات مشترک نظر آتی ہے کہ مزارعت کو معاہدہ کی شرائط کے تابع قرار دیا جاتا تھا، اور یہ صورت کہیں نہیں تھی کہ کسی شخص کو زمین مزارعت پر دینے کے بعد مالک کو اس کے ساتھ مزارعت ختم کرنے کا حق باقی نہ رہے۔

۱۷۔ درحقیقت مزارعت کی مدت معاہدہ ختم ہونے کے بعد اگر کوئی شخص یک طرفہ طور پر زمین میں کاشت کرتا رہے، تو اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ مالک کی مرضی کے بغیر اس کی ملکیت کو استعمال

---

(۱) صحیح مسلم، شرح نووی۔

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، باب حکم ارض خیبر، حدیث نمبر ۳۰۰۷۔

(۱) مصنف عبد الرزاق۔ ص ۱۰۰ ج ۸، حدیث نمبر ۱۴۴۷۶۔

کر رہا ہے. اور اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے:

من زرع في أرض قوم بغير إذنه فليس له من الزرع شيئ، وله نفقته.

جو شخص دوسرے لوگوں کی زمین ان کی اجازت کے بغیر کاشت کرے تو اس کے لئے کھیتی کا کوئی حصہ حلال نہیں، البتہ اس کے لئے اپنے خرچ (اور محنت) کے بقدر (کھیتی) حلال ہے۔ (۲)

اس کے علاوہ اس فیصلے کے پیراگراف نمبر ۶۸ سے ۸۴ تک وہ احادیث ذکر کی جاچکی ہیں، جن میں کسی دوسرے کے مال. بالخصوص زمین کو اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرنے پر شدید وعیدیں مذکور ہیں. ان سے بھی یہی نتیجہ بر آمد ہوتا ہے۔

۱۷۲۔ انہی دلائل کی بناء پر فقہاء کرام نے مزارعت کی صحت کے لئے یہ شرط ضروری قرار دی ہے کہ مزارعت کا معاملہ کرتے وقت کس معین مدت کا بیان ضروری ہے. البتہ اگر کسی علاقے میں کسی خاص مدت کا ایسا رواج ہو کہ تمام زمینیں اسی مدت کے لئے کرایہ یا مزارعت پر دی جاتی ہوں، تو اس صورت میں مزارعت کی مدت بیان کئے بغیر بھی معاملہ درست ہو جاتا ہے. اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ زمین مروجہ مدت کے لئے مزارعت پر دی گئی، چنانچہ صاحب در مختار لکھتے ہیں:

في بلادنا تصح بلا بيان مدة، ويقع على أول زرع واحد.

ہمارے علاقے میں مدت کا بیان کیئے بغیر بھی مزارعت درست ہو جاتی ہے، اور اس کو صرف ایک فصل کے لئے سمجھا جائے گا۔ (۱)

یہ موقف صرف فقہاء حنفیہ کا نہیں. بلکہ تمام فقہاء اسی کے قائل رہے ہیں، چنانچہ علامہ ابن منذر لکھتے ہیں:

وأجمع على أن اكتراء الأرض بالذهب والفضة وقتاً معلوماً جائز.

اور فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ زمین کو نقدی کے عوض ایک معین وقت کے لئے کرایہ پر لینا جائز ہے۔ (۲)

اور ڈاکٹر سعدی ابو حبیب لکھتے ہیں:

---

(۲) جامع الترمذی. ابواب الاحکام. باب نمبر ۲۹. حدیث نمبر ۱۳۷۸۔

(۲) کتاب الاجماع لابن المنذر. ص ۱۲۷. مسئلہ نمبر ۵۴۴۔

(۳) موسوعۃ الاجماع. ص ۹۹۶ ج ۲. طبع بیروت۔

(۱) الدر المختار مع رد المختار. ص ۱۹۳ ج ۵. مطبوعہ کوئٹہ۔

إن المزارعة على جزء شائع عما يخرج من الأرض كالثلث أو النصف أو السدس أو إلى جزء مسمى منصوبا من الجميع إلى مدة معروفة جائزة بالاجماع المتيقن المقطوع به.

بٹائی کا معاملہ اس طرح کرنا کہ زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار کا ایک متناسب (Proportionate)حصہ زمین کی اجرت کے طور پر مقرر کیا گیا ہو، مثلاً تھائی، آدھا یا چھٹا حصہ، یا کوئی بھی ایسا متعین حصہ جس کی نسبت مجموعی پیداوار سے ہو، اور معاملہ کی ایک مدت مقرر کی گئی ہو، با جماع یقینی طور پر جائز ہے۔ (۳)

اس پوری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مزارعت قرآن و سنت کی رو سے ایک معاہدہ ہے، جس میں معاملے کی مدت کا بیان ضروری ہے، اور جب فریقین کے درمیان کوئی مدت مقرر ہو جائے تو فریقین پر اس کی پابندی لازم ہے، اور کسی فریق کو اس مدت سے زائد مزارعت کے معاملے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کا پیراگراف ۲۵ شق ایک چونکہ ان احکام سے ٹکراتا ہے، لہٰذا اس کے معاملے میں اپیل کنندہ کی اپیل منظور کرتے ہوئے پیراگراف نمبر ۲۵ شق ایک کو مکمل طور پر قرآن و سنت کے متصادم قرار دیا جاتا ہے۔

ٹیکس اور بیج وغیرہ کے اخراجات

۱۷۳۔ مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کے پیراگراف نمبر ۲۵ شق نمبر ۲ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ۱۹۷۲ء کی فصل خریف سے

(۱) زمین پر عائد ہونے والے تمام ٹیکس اور سرکاری واجبات زمیندار کے ذمہ ہوں گے۔

(۲) آبیانہ کی ادائیگی اور بیج فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی زمیندار پر ہو گی۔

(۳) کھاد اور کیڑے مار ادویہ کے اخراجات زمیندار اور کاشت کار کے درمیان برابر تقسیم ہوں گے۔

اپیل کنندہ کو ان احکام پر بھی اعتراض ہے، اور اس کا موقف یہ ہے کہ اس معاملے میں مالک زمین کو مکمل اختیار ہونا چاہئے کہ وہ مزارعت کی جو شرائط چاہے، طے کر لے۔

۱۷۴۔ لیکن اپیل کنندہ کا یہ موقف قابل تسلیم نہیں، جیسا کہ پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے، اسلام نے

زمین پر انفرادی ملکیت کو تسلیم تو کیا ہے، لیکن یہ ملکیت ہر حال میں شرعی احکام کے تابع اور اس کی پابند ہے، لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ معاہدہ کے شرائط طے کرنے میں مالک زمین مکمل طور پر خود مختار اور آزاد ہے۔

۱۷۵۔ جہاں تک زمین پر عائد ہونے والے ٹیکسوں اور سرکاری واجبات کا تعلق ہے، چونکہ ان کا تعلق زمین کی ملکیت سے ہے، اس لئے ان کو یا ان کے کسی حصے کو کاشت کار کے ذمے ڈالنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر انہیں کاشت کار کے ذمہ ڈالا جائے گا تو شرعاً ایسا کرنا جائز ہی نہ ہو گا، لہٰذا اگر قانون میں یہ ٹیکس صرف زمیندار پر عائد کئے گئے ہیں، اور اسے کاشت کار پر ڈالنے کی اجازت نہیں دی تو یہ شریعت کے عین مطابق ہے، اور اسے کسی بھی طرح قرآن و سنت سے متصادم نہیں کہا جا سکتا۔

۱۷۶۔ جہاں تک بیج کا تعلق ہے، اس کی ذمہ داری بھی زمیندار پر ڈالنے میں نہ صرف یہ کہ شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، بلکہ بعض فقہاء کرام کے نزدیک تو بیج کاشت کار کے ذمہ ڈالنا جائز ہی نہیں، چنانچہ علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

"ظاهر المذهب أن المزارعة إنما تصح إذا كان البذر من رب الأرض و العمل من العامل . . . و هو مذهب ابن سيرين و الشافعي و إسحاق . لأنه عقد يشترك العامل و رب المال في نمائه . فوجب أن يكون رأس المال كله من عند أحدهما كالمساقات و المضاربة .

حنبلی مذہب کی ظاہر روایت یہ ہے کہ مزارعت اس صورت میں درست ہو سکتی ہے جب بیج زمین دار فراہم کرے، اور کاشت کار کی صرف محنت ہو، ...... یہی محمد بن سیرینؒ امام شافعیؒ اور امام اسحاقؒ کا مذہب ہے، کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ اس میں نفع حاصل کرنے کے لئے محنت کار اور مالک سرمایہ مل کر آپس میں شرکت کرتے ہیں، لہٰذا سرمایہ پورا کا پورا مالک کی طرف سے ہونا چاہئے، جیسا کہ مساقات اور مضاربت میں ہوتا ہے۔ (۱)

اگرچہ دوسرے فقہاء (جن میں فقہاء حنفیہ بھی داخل ہیں) یہ فرماتے ہیں کہ اگر فریق متفق ہوں تو بیج کی ذمہ داری کاشت کار پر بھی ڈالی جا سکتی ہے، لیکن ایسا کرنا کوئی ضروری نہیں۔ (۲)

---

(۱) المغنی لابن قدامہ، ص ۴۲۳ ج ۵۔ مطبوعہ ریاض۔ سعودی عرب۔

(۲) ردالمحتار، ص ۱۹۵، ۱۹۶ ج ۵۔ مطبوعہ کوئٹہ۔

لہٰذا اگر قانون میں بیج فراہم کرنے کی ذمہ داری مالک زمین پر عائد کی ہے، تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں جسے قرآن و سنت سے متصادم کہا جائے۔

۱۷۷۔ یہی معاملہ آبیانے کا بھی ہے، کہ کھیتی کو سیراب کرنے کا عمل اگرچہ کاشت کار کے ذمہ ہے، لیکن اس پر آنے والے اخراجات اگر زمیندار پر عائد کئے جائیں تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، چنانچہ بعض فقہاء نے فرمایا کہ:

فأما البقرة التي تدير الدولاب فقال أصحابنا: هي على رب المال۔ لأنها ليست من العمل.

وہ بیل جو رہٹ چلانے کے لئے استعمال کیا جائے، ہمارے فقہاء کا قول ہے کہ اس کا فراہم کرنا زمین دار کے ذمہ ہے، کیونکہ وہ عمل کا حصہ نہیں۔ (۱)

لہٰذا آبیانے کو زمیندار کے ذمہ قرار دینا بھی قرآن و سنت کے احکام سے متصادم نہیں۔

۱۷۸۔ جہاں تک کھاد اور کیڑے مار دواؤں کو نصف نصف تقسیم کرنے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بھی قرآن و سنت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں، اور فقہاء کرام کی آراء اس میں مختلف ہیں، علامہ ابن قدامہؒ نے امام شافعیؒ کا قول بیان کیا ہے کہ:

"فأما تسميد الأرض بالزبل إن احتاجت إليه فشراء ذالك على رب المال لأنه ليس من العمل، فجرى مجرى ما يلحق به.

جہاں تک زمین میں گوبر وغیرہ کی کھاد ڈالنے کا تعلق ہے، اگر زمین کو اس کی ضرورت ہو تو اس کی خریداری کی ذمہ داری زمیندار پر ہوگی، کیونکہ وہ عمل کا حصہ نہیں، لہٰذا اس کا وہی حکم ہو گا جو جفتی کرنے کے آلات کا حکم ہوتا ہے۔ (۲)

لہٰذا اگر پوری کھاد اور پوری دواؤں کا خرچہ بھی زمیندار پر ڈالا جائے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، اب جب کہ یہ اخراجات دونوں پر نصف نصف ڈالے گئے ہیں، تو بطریق اولیٰ یہ قانون قرآن و سنت سے متصادم نہیں، لہٰذا مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کے پیراگراف نمبر ۲۵ شق نمبر ۲ کے بارے میں یہ اپیل مسترد کی جاتی ہے۔

---

(۱) المغنی لابن قدامہ، ص ۴۰۲ ج ۵۔

(۲) ایضاً، ص ۴۰۲ ج ۵۔

حق کاشت کاری کی وراثت

۱۷۹۔ شریعت اپیل نمبر۲۱ در ۱۹۸۴ء حکومت پنجاب کی طرف سے دائر کی گئی ہے، جس کا پس منظر یہ ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ نے دستور پاکستان کی دفعہ ۲۰۳۔ ڈی کے تحت خود اپنی تحریک پر پنجاب ٹیننسی ایکٹ ۱۸۸۷ء کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی دفعہ ۶۰۔ اے میں ایک ترمیم کا حکم دیا، اس فیصلے کے خلاف صوبائی حکومت پنجاب نے یہ اپیل دائر کی ہے۔

۱۸۰۔ پنجاب ٹیننسی ایکٹ کی دفعہ ۶۰۔ اے کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی کاشت کار نہ تو موروثی کاشت کار (Occupancy Trnant) ہو، اور نہ کسی ایسی زمین کا کاشت کار ہو جو زمیندار نے کسی مروجہ قانون کے تحت ذاتی کاشت کے لئے محفوظ رکھی ہو، اور نہ اس کی کاشت کاری کسی معاہدے یا کسی ہیئت مجاز کے فیصلے یا حکم کے تحت کسی معین مدت کے لئے ہو، اگر ایسا کاشت کار مر جائے، تو اس کا حق کاشت کاری اس کے مرنے کے بعد اس کے ترجیحی وارث (Preferred Heir) کی طرف منتقل ہو جائے گا اور اگر اس کا کوئی ترجیحی وارث نہ ہو تو اس کے سب سے بڑے بیٹے کی طرف۔

۱۸۱۔ فیڈرل شریعت کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ ہدایت دی ہے کہ اگر کاشت کار مسلمان ہو تو ترجیحی وارث یا بیٹے کے بجائے یہاں حق کاشت کاری کاشت کار کے شخصی قانون کے مطابق اس کے تمام ورثاء کی طرف منتقل کرنے کا اثر رکھتی ہو۔

۱۸۲۔ اپیل کنندہ نے اپنی وجوہات اپیل میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حق کاشت کاری اسلام کی رو سے قابل وراثت نہیں ہے، لہٰذا اس کو تمام ورثاء کی طرف منتقل کرنے کا حکم دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۱۸۳۔ میں اپیل کنندہ کے اس موقف سے اتفاق کرتا ہوں، اوپر شریعت اپیل نمبر۴ در ۱۹۸۱ء کا تصفیہ کرتے ہوئے قرآن و سنت کے دلائل سے یہ ثابت کیا جاچکا ہے کہ مزارعت یا کاشتکاری ایک معاہدہ ہے، جو فریقین کی رضامندی سے وجود میں آتا ہے، اور معاہدہ کے شرائط کے تابع ہوتا ہے، لہٰذا کسی بھی حالت میں ایک فریق کو اس معاہدے کے باقی رکھنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اور چونکہ عام معاہدات کا حال یہ ہے کہ وہ فریقین میں سے کسی ایک کی موت پر ختم ہو جاتے ہیں، الا یہ کہ معاہدے ہی میں اس کے خلاف کوئی صراحت موجود ہو، اس لئے حق کاشتکاری کوئی ایسی جائیداد نہیں ہے جو قابل وراثت ہو، اپیل کنندہ نے وجوہات اپیل کے ساتھ جو تحریری بیان داخل کیا ہے، اس میں اسلامی احکام کے جو حوالے دیئے گئے ہیں، ان سے بلاشبہ یہی ثابت ہوتا ہے۔

۱۸۴۔ فاضل وفاقی شرعی عدالت نے اپنے فیصلے میں حق کاشتکاری کو قابل وراثت قرار دینے کے لئے جس بات پر انحصار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ رائج الوقت قوانین کے تحت جن میں مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ اور (Punjab Protection And Restoration of Tenancy Right 1950) داخل ہیں، یہ حکم دیا گیا ہے کہ کسی کاشت کار کو کسی زمین سے اس وقت تک بے دخل نہیں کیا جا سکے گا، جب تک ان بنیادوں میں سے کوئی بنیاد نہ پائی جائے جو ان قوانین میں درج ہیں، فاضل وفاقی شرعی عدالت کا کہنا یہ ہے کہ ان قوانین کی موجودگی میں اب کاشتکار کا حق ایک دائمی حق بن گیا ہے، جو کاشتکار کی موت پر ختم نہیں ہوتا، لہٰذا اس کو قابل وراثت ہونا چاہئے۔

۱۸۵۔ لیکن شریعت اپیل نمبر۴ در ۱۹۸۱ء کا تصفیہ کرتے ہوئے قرآن و سنت کے دلائل کی رو سے میں یہ قرار دے چکا ہوں کہ مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ کا پیراگراف ۲۵۔ اے جو کاشتکاری کو علی الاطلاق ایک دائمی حق قرار دیتا ہے، قرآن و سنت کے احکام سے متصادم ہے، لہٰذا جس بنیاد پر فاضل وفاقی شرعی عدالت نے حق کاشتکاری کو قابل وراثت قرار دیا، اس کے منہدم ہو جانے کے بعد فاضل وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے لئے کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

۱۸۶۔ لیکن جب ایک مرتبہ یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ حق کاشتکاری قابل وراثت نہیں ہے بلکہ معاہدے کی شرائط کے تابع ہے، اور خود اپیل کنندہ نے اپنی اپیل میں اسی موقف پر زور دیا ہے، اور اس کے دلائل فراہم کئے ہیں، تو جس طرح حق کاشتکاری کا ورثاء کی طرف منتقل ہونا غلط قرار پاتا ہے، اسی طرح ترجیحی وارث یا سب سے بڑے بیٹے کی طرف منتقل ہونا بھی قرآن و سنت کے احکام کی رو سے درست نہیں، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ مالک کی مرضی کے بغیر کسی خاص شخص کے ساتھ مزارعت کا معاہدہ جبری طور پر عمل میں لایا گیا ہے، اور اس فیصلے کے پیراگراف نمبر۶۵ سے ۸۴ تک جو احادیث نقل کی گئی ہیں، وہ اس کے ناجائز ہونے پر دلالت کرتی ہیں، نیز حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث:

من زرع في أرض قوم بغير إذنهم فليس له من الزرع شيئ وله نفقته.

جو شخص دوسروں کی زمین میں اس کی اجازت کے بغیر کاشت کرے، اس کے لئے کھیتی کا کوئی حصہ حلال نہیں، ہاں اس کا کیا ہوا خرچ اس کا حق ہے۔ (۱)

یہ حدیث بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر کوئی شخص جبراً کسی کی

---

(۱) جامع الترمذی، ابواب الاحکام، باب نمبر۲۹، حدیث نمبر۱۳۷۸۔

زمین کا کاشت کار نہیں بن سکتا۔

اور یہ تمام احکام در حقیقت اس اصول پر مبنی ہیں، جو قرآن کریم کی اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا:

یا أیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم۔

اس اصول کے مزید دلائل اس فیصلے کے پیراگراف نمبر۱۲۲ میں تفصیل کے ساتھ ذکر کئے جا چکے ہیں، لہٰذا اپیل کنندہ نے اپنی وجوہات اپیل میں جو موقف اختیار کیا ہے کہ حق کاشتکاری قابل وراثت نہیں ہے، بلکہ کاشت کار کی موت پر ختم ہو جاتا ہے، اس کا منطقی تقاضہ یہ ہے کہ کاشتکار کی موت کے بعد کاشتکاری کسی بھی شخص کی طرف جبراً منتقل نہ کی جائے، لہٰذا پنجاب ٹیننسی ایکٹ ۱۸۸۷ء کی دفعہ ۶۰۔ اے جو یہ حق ترجیحی وارث یا بڑے بیٹے کی طرف منتقل کرتی ہے، مذکورہ بالا اصول کے تحت پوری کی پوری قرآن و سنت سے متصادم ہے۔

۱۸۷۔ اگرچہ عوام الناس کی طرف سے کوئی ایسی اپیل ہمارے سامنے نہیں ہے، جو مذکورہ ایکٹ کی دفعہ ۶۰۔ اے کو قرآن و سنت سے متصادم بنا دینے کا مطالبہ کر رہی ہو، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حق کاشتکاری کے ناقابل وراثت ہونے کا معاملہ دفعہ ۶۰۔ اے کی شرعی حیثیت سے اس قدر پیوستہ ہے کہ ہمارے سامنے صوبائی حکومت پنجاب کی جو اپیل زیر سماعت ہے، قرآن و سنت کی روشنی میں اس کا ٹھیک ٹھیک تصفیہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ دفعہ ۶۰۔ اے کے احکام کو اسکے مجموعی تناظر (Perspective) میں دیکھ کر اس کے بارے میں قرآن و سنت کے احکام کا صحیح منشا تلاش نہ کیا جائے، چنانچہ میرے نزدیک اس اپیل کا تصفیہ کرتے ہوئے دفعہ ۶۰۔ اے کی مجموعی شرعی حیثیت کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ دینا اپنے حدود اختیار سے تجاوز نہیں، لہٰذا پنجاب ٹیننسی ایکٹ ۱۸۸۷ء کی دفعہ ۶۰۔ اے کو قرآن و سنت سے متصادم قرار دیا جاتا ہے۔

زیر نظر قوانین کے بارے میں فیصلے کا خلاصہ

۱۸۸۔ اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵ (لینڈ ریفارمز ریگولیشن ۱۹۷۲ء) کی دفعہ ۸، ۹ میں ملکیت کی حد نہری زمین میں ۱۵۰ ایکڑ، اور بارانی زمین میں ۳۰۰ ایکڑ یا بارہ ہزار پیداواری یونٹ (جو بھی زیادہ ہو) مقرر کی گئی تھی، اور اسی دفعہ کی شق (۲) سے واضح ہے کہ اس تحدید کا مقصد یہ ہے کہ اس

سے زیادہ زمین مالک سے بلامعاوضہ لے لی جائے ـــــ دفعہ ۱۰ میں سرکاری ملازمین کے لئے ۱۰۰ ایکڑ کی حد اسی لئے مقرر کی گئی ہے، اور دفعہ ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ میں مذکورہ حد سے زائد ہر زمین کو سرکاری ملکیت قرار دیا گیا ہے۔ اور دفعہ ۱۸، ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ میں اس طرح لی ہوئی زمینوں کو استعمال کرنے کے طریقے متعین کئے گئے ہیں۔

اسی ریگولیشن کی دفعہ ۷ میں زمینوں کے ایسے انتقالات پر پابندی عائد کی گئی ہے جن کے ذریعہ تحدید ملکیت کے احکام سے فرار اختیار کیا جا سکتا ہو، اس دفعہ کا مقصد بھی بلامعاوضہ زمینوں کے حصول کی رکاوٹوں کو دور کرنا ہے۔

جو بحث اوپر کی گئی ہے، اس کی روشنی میں کسی کی جائز ملکیت ۰۰۰۰۰۰ پر بلامعاوضہ قبضہ کرنا متعدد آیات قرآنی اور بہت سی احادیث کے صریحا مخالف ہے۔ اور چونکہ ان دفعات سے ان آیات واحادیث کی خلاف ورزی ہوتی ہے، لہٰذا ان تمام دفعات کو قرآن و سنت سے متصادم قرار دیا جاتا ہے۔

(۲) نیز اسی ریگولیشن کی دفعہ ۲۵ ذیل دفعہ ایک میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ کوئی زمیندار چند مخصوص صورتوں کے سوا کسی بھی حالت میں اپنے مزارع کا انخلاء نہیں کر سکتا۔

اوپر کی بحث کی روشنی میں قرآن و سنت کے دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ مزارعت کی مدت (Tenure) فریقین کے باہمی معاہدے کے تابع ہوتی ہے، لہٰذا اس ریگولیشن کی دفعہ ۲۵ ذیلی دفعہ ایک کو بھی قرآن و سنت کے احکام سے متصادم قرار دیا جاتا ہے۔

البتہ اس ریگولیشن کی دفعہ ۲۲ میں تقسیم اراضی پر جو پابندی عائد کی گئی ہے، اور دفعہ ۲۴ میں اس غرض کے لئے انتقال پر جو پابندی عائد کی گئی ہے، اس کے بارے میں فیصلہ محفوظ رکھا جاتا ہے، اور دفعہ ۲۵ ذیلی دفعہ ۲ میں زمیندار پر جو ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں، ان کے بارے میں یہ قرار دیا جاتا ہے کہ وہ قرآن و سنت کے احکام سے متصادم نہیں ہیں۔

(۳) اسی طرح پنجاب ٹیننسی ایکٹ ۱۸۸۷ء کی دفعہ ۶۰۔ اے کے بارے میں یہ قرار دیا جاتا ہے کہ وہ اس لحاظ سے قرآن و سنت کے احکام سے متصادم ہے کہ اس میں کاشتکار کی موت کے بعد جب کاشتکاری اس کے ترجیحی وارث (Preferred heir) یا اس کی غیر موجودگی میں اس کے بڑے بیٹے کی طرف منتقل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جب کہ حق کاشتکاری وراثت میں کسی کو منتقل نہیں ہو سکتا۔

(۴) لینڈ ریفارمز ایکٹ ۱۹۷۷ء کی دفعہ ۳ کے ذریعہ زمین کی ملکیت کی حد مزید گھٹا کر نہری زمین میں ۱۰۰ ایکڑ اور بارانی زمین میں ۲۰۰ ایکڑ (یا آٹھ ہزار پیداواری یونٹ) کر دی گئی ہے، دفعہ

۴، ۵ اور ۶ کے ذریعے اسی تحدید ملکیت کے مقاصد حاصل کرنے کے لئے زمینوں کی تقسیم اور انتقالات پر مختلف پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ دفعہ ۹ کے ذریعے یہ حکم دیا گیا ہے کہ یوم آغاز قانون سے چار ماہ کے اندر یہ زمینیں حکومت کے حوالے کر دی جائیں، جو ان کی مالک تصور ہوگی۔ پھر دفعہ ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ میں حکومت کی طرف سے دفعہ ۹ کے تحت لی گئی زمینوں کا معاوضہ ادا کرنے کے احکام دیئے گئے ہیں۔ اور دفعہ ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ میں اس طرح حاصل کی گئی زمینوں کے استعمال کے متعلق قوانین بنائے گئے ہیں۔

۱۸۹۔ مذکورہ بالا بحث میں واضح کیا جا چکا ہے کہ کسی شخص کی جائز ملکیت کو زبردستی معاوضہ دے کر لینا صرف "ضرورت" اور "عمومی حاجت" کے تحت جائز ہے، جس کی شرائط بیان ہو چکی ہیں۔ ان شرائط میں سے تین شرطیں یہ ہیں:

(الف) "ضرورت" اور "عمومی حاجت" کو دور کرنے کا اس جبری خریداری کے سوا کوئی راستہ نہ ہو، اور یہ فیصلہ تمام ممکنہ متبادل طریقوں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد کیا گیا ہو۔ للذا محض مفاد عامہ (Public Interest) کی مجمل بنیاد کافی نہیں، جب تک "ضرورت" یا "عمومی حاجت" کا تیقن نہ ہو چکا ہو۔

زیر نظر قانون میں یہ شرط اس لئے مفقود ہے کہ، جیسا کہ اس قانون کی تمہید (Preamble) میں کہا گیا ہے، اس کا مقصد "زیادہ منصفانہ تقسیم دولت" ہے، حالانکہ "زیادہ منصفانہ تقسیم دولت" اور بیجا ارتکاز دولت کے انسداد کے لئے اسلام نے جو طریقے اختیار کئے ہیں، اور جن کا ذکر اس فیصلے میں ہو چکا ہے، ان کو اختیار کئے بغیر یہ قدم اٹھایا گیا ہے۔ جب "زیادہ منصفانہ تقسیم دولت" کے متبادل طریقے موجود ہیں تو وہ "ضرورت" یا "عمومی حاجت" نہیں پائی گئی جو جبری خریداری کے جواز کی لازمی شرط ہے۔

(ب) جبری خریداری کے جواز کی دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا معاوضہ بازاری نرخ (Market value) کے مطابق ادا کیا جائے، جب کہ مذکورہ قانون کی دفعہ ۱۱ میں ہر پیداواری یونٹ کا معاوضہ ۳۰ روپے مقرر کیا گیا ہے، خواہ اس کا بازاری نرخ کچھ بھی ہو، اور دفعہ ۱۲ میں زمین پر پائی جانے والی تنصیبات (Installations) کی وہ قیمت لگائی گئی ہے، جو ان کی اصل لاگت (Cost) کے برابر ہو، خواہ ان کی موجودہ بازاری قیمت کتنی بڑھ چکی ہو۔

(ج) جبری خریداری کی تیسری شرط یہ تھی کہ معاوضہ یا تو قبضے سے پہلے یا اس کے ساتھ ساتھ ادا کر دیا جائے، یا اتنی دیر میں کہ اسے قابل ذکر تاخیر نہ سمجھا جاتا ہو، لیکن دفعہ نمبر ۱۳ کے تحت یہ ادائیگی سودی بانڈز کے ذریعے کرنے کا حکم لیا گیا ہے۔

ان وجوہ سے اس ایکٹ کی مذکورہ بالا دفعات کو بھی قرآن و سنت سے متصادم قرار دیا جاتا ہے۔

نتائج

۱۹۰۔ مذکورہ بالا تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ مندرجہ ذیل قوانین کو قرآن و سنت سے متصادم قرار دیا جاتا ہے:

(۱) لینڈ ریفارمز ریگولیشن ۱۹۷۲ء (مارشل لاء ریگولیشن ۱۱۵) کی دفعات ۷، ۸، ۹ اور دفعات ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰ اور ۲۱، نیز دفعہ ۲۵ کی ذیلی دفعہ نمبر ایک۔

(۲) لینڈ ریفارمز ایکٹ ۱۹۷۷ء کی دفعہ ۳، ۴، ۵، ۶ دفعہ ۹، دفعہ ۱۱، ۱۲، ۱۳ اور دفعہ ۱۵، ۱۶ اور ۱۷۔

(۳) دی پنجاب ٹیننسی ایکٹ نمبر ۱۶۔ در۔ ۱۹۸۷ء کی دفعہ ۶۰۔ اے ان تصریحات کے ساتھ شریعت اپیل نمبر ایک ۱۹۸۱ء اپیل نمبر ۳، ۸، ۹، ۱۰۔ ۱۹۸۱ء اور اپیل نمبر ایک ۱۹۸۷ء منظور کی جاتی ہیں اور اپیل نمبر ۴۔ در۔ ۱۹۸۱ء اور اپیل نمبر ۲۱۔ در۔ ۱۹۸۴ء کو جزوی طور پر منظور کیا جاتا ہے۔

اپیل نمبر ایک، ۱۹۸۱ء میں اپیل کنندہ چونکہ ایک وقف ہے، اس لئے اس کے اخراجات مقدمہ مسئول الیہ وفاقی حکومت ادا کرے گی، باقی اپیلوں کے اخراجات کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا جا رہا۔

(محمد افضل ظلہ)
چیئرمین

(محمد تقی عثمانی)
ممبر

(نسیم حسن شاہ)
ممبر

(شفیع الرحمٰن)
ممبر

(پیر محمد کرم شاہ)
ممبر

(اشاعت کے لئے منظور ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضمیمہ

ملکیت زمین پر کچھ شبہات اور ان کا جواب

ملکیت زمین کا مسئلہ تشنہ رہے گا، اگر یہاں بعض ان "دلائل" یا شبہات پر گفتگو نہ کی جائے جو ہمارے دور کے بعض اہل قلم نے یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کیے ہیں کہ زمین انفرادی ملکیت کے تحت نہیں آ سکتی۔ چنانچہ یہ شبہات اور ان کے جوابات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:-

۱۔ زمین اللہ کی ہے

ملکیت زمین کی نفی کے لئے آجکل قرآن کریم کی جو آیت سب سے پہلے خاصے زور و شور کے ساتھ پیش کی جاتی ہے، وہ سورۂ اعراف کی یہ آیت ہے:

ان الارض للہ یورثہا من یشاء من عبادہ

بلاشبہ زمین اللہ کی ہے۔ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، اس کو وارث بنا دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب زمین اللہ کی ملکیت ہے تو وہ کسی شخص کی انفرادی ملکیت میں نہیں آ سکتی اور جس طرح ایک وقف اللہ کی ملکیت ہونے کی وجہ سے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بن سکتا، اسی طرح زمین بھی کسی کی شخصی جائیداد نہیں بن سکتی۔

ہم نے تصور ملکیت کے بارے میں قرآن کریم کے جو ارشادات پیچھے ذکر کیے ہیں ان کو غیر جانب داری اور انصاف کے ساتھ دیکھ لیا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اس دلیل میں کوئی ادنیٰ

---

(۱) الاعراف ۷:۱۲۸

وزن نہیں ہے۔ جس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) جس طرح زمین کے بارے میں قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ وہ اللہ کی ہے، اسی طرح زمین و آسمان کی ہر چیز کے بارے میں بالکل یہی الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں، بلکہ ایسی آیات کی تعداد کہیں زیادہ ہے جن میں زمین و آسمان میں پائی جانے والی ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وللہ ما فی السموات وما فی الأرض۔

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔

بلکہ پہلی آیت میں تو صرف یہ کہا گیا تھا کہ "زمین اللہ کی ہے"، لیکن اس آیت میں کہا گیا ہے کہ "اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے"۔ یعنی اس میں ملکیت کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں منحصر کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اگر پہلی آیت کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ زمین "اللہ کی ملکیت" ہونے کی وجہ سے کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں آ سکتی، تو دوسری آیت میں زیادہ قوت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آسمان و زمین کی کوئی چیز (بشمول اشیائے صرف) "اللہ ہی کی ملکیت" ہونے کی وجہ سے کسی بھی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں بن سکتی، پھر زمین کی کیا خصوصیت ہے؟ روٹی کپڑے سے لے کر فرنیچر اور دوسرے گھریلو ساز و سامان تک کسی بھی چیز پر کسی انسان کی انفرادی ملکیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ ان چیزوں کے بارے میں آج کوئی کٹر سے کٹر اشتراکی شخص بھی یہ نہیں کہتا کہ یہ ذاتی ملکیت میں نہیں آ سکتیں۔

اس سے صاف واضح ہو گیا کہ کسی چیز کا "اللہ کی ملکیت" یا "اللہ ہی کی ملکیت" ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیوی احکام کے لحاظ سے وہ کسی انسان کی انفرادی ملکیت نہیں بن سکتی، بلکہ اس سے ملکیت کے اسی بنیادی تصور کی طرف اشارہ ہے، کہ "حقیقی ملکیت" ہر چیز پر اللہ ہی کی ہے، وہ زمین ہو یا مکان، کھانا کپڑا ہو یا دوسرا ساز و سامان، ان سب چیزوں کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے، چنانچہ اس کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ وہ جس کو چاہے، یہ چیزیں دے دے، جس سے چاہے، واپس لے لے، اور جس کسی کو دے، اس کو جن شرائط کا چاہے، پابند کر دے، لیکن اسی "حقیقی ملکیت" کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو خاص شرائط اور احکام کے ساتھ ان اشیاء پر ایک

---

(۲) یہ اور اس سے ملتے جلتے الفاظ قرآن مجید میں دسیوں جگہ پر مذکور ہیں۔ مثلاً البقرہ ۲:۱۰۷، آل عمران ۳:۱۰۹، نساء ۴:۱۲۶، ۱۳۱ و۱۳۲، انعام ۶:۱۲، یونس ۱۰:۵۵ و۶۶، الرعد ۱۳:۱۶، ابراہیم ۱۴:۲، النحل ۱۶:۵۲، طہ ۲۰:۶، الحج ۲۲:۶۴، النور ۲۴:۶۴، الروم ۳۰:۲۶، لقمان ۳۱:۲۶، سبا ۳۴:۱، الشوریٰ ۴۲:۴۔

"قانونی ملکیت" عطا فرما رکھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے قوانین و احکام کے لحاظ سے ایسے انسانوں کو ان چیزوں کا مالک سمجھا جائے گا. اور وہ شرعی احکام کے دائرے میں رہتے ہوئے ان اشیاء پر مالکانہ تصرف کے مجاز ہوں گے۔ اس معاملے میں زمین اور اشیائے صرف میں اللہ تعالیٰ نے کوئی فرق روا نہیں رکھا. بلکہ تمام اشیاء کو ایک ہی حکم میں قرار دیا ہے. جیسا کہ پچھلے باب میں قرآنی آیات کے حوالے سے تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاچکا ہے۔

(۲) آگے پیچھے کے الفاظ کو بالکل فراموش کر کے کوئی شخص عبارت کے صرف درمیانی ایک دو لفظ کو پکڑ کر بیٹھ جائے تو بات اور ہے. ورنہ سورۂ اعراف کی مذکورہ آیت کو اگر پورے سیاق و سباق کے ساتھ پڑھا جائے تو اس سے نہ صرف یہ کہ زمین پر شخصی ملکیت کی نفی نہیں ہوتی. بلکہ اس سے زمین کی ذاتی ملکیت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس لئے کہ دراصل اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک مقولہ بیان کیا گیا ہے جو آپ نے فرعون کے ایک متکبرانہ جملے کے جواب میں اپنی قوم سے کہا تھا۔ پوری آیت اس طرح ہے:

قال: سنقتل أبناءهم و نستحيي نساءهم و إنا فوقهم قاهرون. قال موسى لقومه استعينوا بالله و اصبروا إن الأرض لله يورثها من عباده من يشاء.

> فرعون نے کہا کہ ہم ان بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کر ڈالیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے. اور ہم اور موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تم اللہ سے مدد مانگو. ان پر (ہمیشہ) غالب رہیں گے۔ اور صبر کرو۔ بلاشبہ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے. اس کو وارث بنا دیتا ہے (۱)

فرعون نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ ہمیشہ بنی اسرائیل پر بالا دست رہے گا. اور مصر کا مالک ہونے کی حیثیت سے ان کو اپنے قہر کا نشانہ بنائے رکھے گا۔ فرعون کے اس جابرانہ اعلان سے بنی اسرائیل کو طبعی طور پر جو تشویش لاحق ہوئی ہوگی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کا ازالہ کرنے کے لئے اپنی قوم سے فرمایا کہ فرعون سمجھتا ہے کہ مصر کی سرزمین کا مالک وہ ہے. حالانکہ پوری زمین پر حقیقی ملکیت اللہ کی ہے. وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے، اس کی ملکیت عطا کر دیتا ہے۔ اگر آج اس سے یہ ملکیت فرعون کو دے رکھی ہے تو کل بنی اسرائیل کو دے سکتا ہے۔ لہٰذا فرعون سے ڈرنے اور اس سے سہولت مانگنے کے بجائے اللہ سے مدد مانگو. اور صبر سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس زمین کا مالک بنا سکتا ہے۔

---

(۱) الاعراف ۷: ۱۲۸۔

اس سے صاف واضح ہے کہ یہاں زمین پر صرف اللہ تعالیٰ کی حقیقی ملکیت ہی کا بیان نہیں کیا گیا، بلکہ اس "قانونی ملکیت" کو بھی ساتھ ساتھ ذکر کر دیا گیا ہے جو حقیقی انسانوں کو عطا فرماتا ہے۔ اور اس کے لئے لفظ بھی "وارث بنانے" کا استعمال فرمایا گیا ہے کسی چیز کا "وارث" چونکہ اس کا مالک ہوتا ہے، اس لئے اس لفظ نے واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی ملکیت ہی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں جس کو چاہتا ہے زمین کا مالک بنا دیتا ہے۔ زمین پر انسان کی قانونی ملکیت کی اس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہوگی؟

۴۔ زمین مخلوق کے لئے

ایک اسی طرح کا استدلال سورۃ الرحمٰن کی ایک آیت سے بھی کیا جاتا ہے جس میں ارشاد ہے:

اور (اللہ نے) زمین کو مخلوق کے لئے پیدا کیا

کہا جاتا ہے کہ اس آیت کی رو سے زمین پوری مخلوق کے لئے پیدا کی گئی ہے، اور وہ انسانوں کی اجتماعی ملکیت ہے۔ زمین کے کسی حصے کا مالک بن کر دوسروں کو اس کے منافع سے نہیں روک سکتا۔

لیکن یہ "دلیل" پہلی دلیل سے بھی زیادہ کمزور، بلکہ بے بنیاد ہے، جس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اس آیت میں صرف یہ نہیں کہا گیا کہ زمین "انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہے" بلکہ فرمایا یہ گیا ہے کہ زمین "مخلوق کے لئے پیدا کی گئی ہے"۔ لہٰذا اس میں صرف انسان نہیں، بلکہ تمام چوپائے، مویشی، درندے اور ہر قسم کے حیوانات بھی داخل ہیں، مخلوق کے لئے قرآن کریم نے لفظ "الانام" استعمال فرمایا ہے، جس کے معنی کل مخلوق کے ہیں، اور اس میں وہ تمام مخلوقات شامل ہیں جن پر نیند طاری ہوتی ہے۔ عربی لغت کے مشہور عالم علامہ زبیدیؒ لکھتے ہیں:۔

وهو الخلق ، أو كل من لعتريه النوم.

"انام" کے معنی مخلوق کے ہیں، یا یوں کہہ لیجئے کہ وہ تمام مخلوقات جن پر نیند طاری ہوتی ہے۔ (۱)

---

(۱) تاج العروس، للزبیدی ص ۱۹۵ ج ۸

(۲) سورۃ البقرۃ ۲، ۲۹

لہٰذا اگر اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ زمین "انام" کی اجتماعی ملکیت ہے تو اس "اجتماعی ملکیت" میں تمام درندے، پرندے، حشرات الارض اور ہر طرح کے حیوانات بھی شریک ہیں پھر تو یہ کہنا چاہئے کہ انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ زمین کے کسی حصے کو صرف انسانوں کے لئے مخصوص کر کے اس میں جانوروں کا داخلہ منع کر دے۔

(۲) واقعہ یہ ہے کہ اس آیت میں ملکیت کا مسئلہ بیان نہیں کیا جا رہا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت و رحمت کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے یہ بتا رہے ہیں کہ ہم نے زمین تمہارے اور پوری مخلوق کے فائدے کے لئے پیدا کی ہے، اور اس سے مخلوقات کا ہر فرد اپنی ضرورت، صلاحیت اور استطاعت کے مطابق فائدہ اٹھاتا ہے، فائدہ اٹھانے کے طریقے مختلف ہیں۔ کوئی کسی قطعہ زمین کا مالک بن کر اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے، کوئی کرایہ دار یا کاشتکار کی حیثیت میں فائدہ اٹھا رہا ہے، کوئی زمین پر چل کر فائدہ اٹھا رہا ہے، غرض مخلوق کا ہر فرد، خواہ وہ انسان ہو یا حیوان، کسی نہ کسی شکل میں زمین سے مستفید ہو رہا ہے۔

یہ ہے قرآن کریم کے سیاق و سباق کے مطابق آیت کا صحیح مطلب۔ یہاں اس مسئلے سے کوئی بحث نہیں کی جا رہی ہے کہ زمین پر کسی شخص کی قانونی ملکیت تسلیم کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اور نہ معقولیت کی کسی ادنیٰ مقدار کے ساتھ اس آیت میں اس "اجتماعی ملکیت" کا وہ تصور داخل کیا جا سکتا ہے جو عہد حاضر کے بعض اشتراکی مفکرین نے پیش کیا ہے۔

(۳) جس طرح زمین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ مخلوق کے لئے پیدا کی گئی ہے، اس طرح زمین میں پائی جانے والی تمام اشیاء کے بارے میں بھی یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہیں چنانچہ ارشاد ہے:

هو الذى خلق لكم ما فى الأرض جميعاً۔

اللہ وہ ذات ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے۔

اس میں زمین میں پائی جانے والی ہر چیز کے لئے کہا گیا ہے کہ وہ انسانوں کے فائدے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ کیا کوئی شخص اس آیت کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ زمین کی ہر چیز تمام انسانوں کے لئے بنائی گئی ہے۔ لہٰذا کوئی شخص زمین پر پائی جانے والی کسی چیز کا تنہا مالک نہیں ہو سکتا؟ ظاہر ہے کہ یہ بات کوئی کٹر سے کٹر اشتراکی بھی نہیں کہہ سکتا، کیونکہ اشیائے صرف اور ذاتی استعمال کی چیزوں پر انفرادی ملکیت کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے، اگر زمین پر پائی جانے والی اشیاء" کے بارے میں یہ بات

نہیں کہی جا سکتی، اور یقیناً نہیں کہی جا سکتی، تو زمین کے بارے میں وہی بات کیسے درست ہو سکتی ہے جب کہ قرآن کریم میں دونوں جگہ الفاظ ایک ہی جیسے استعمال ہوئے ہیں؟

۳۔ سواءً للسائلین

ایک اور استدلال زمین کی شخصی ملکیت کے خلاف، سورۂ حم السجدہ کی اس آیت سے کیا جاتا ہے:

قل أئنكم لتكفرون بالذى خلق الأرض فى يومين تجعلون له أندادًا ذلك رب العالمين و جعل فيها رواسى من فوقها و بارك فيها و قدر فيها أقواتها فى أربعة أيام سواءً للسائلين.

اس آیت کا ترجمہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے اس طرح فرمایا ہے:

> آپ (ان لوگوں سے) فرمایئے کہ کیا تم لوگ ایسے خدا کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو روز (کی مقدار وقت) میں پیدا کر دیا، اور تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو، یہی (خدا جس کی قدرت معلوم ہوئی) سارے جہان کا رب ہے اور اس نے زمین کے اوپر پہاڑ بنا دیئے، اور اس (زمین) میں فائدے کی چیزیں رکھ دیں (جیسے نباتات و حیوانات وغیرہ) اور اس (زمین) میں اس (کے رہنے والوں) کی غذائیں تجویز کر دیں (... یعنی زمین میں ہر قسم کے غلے میوے پیدا کر دیئے، کہیں کچھ، کہیں کچھ جن کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ یہ سب) چار دن میں (ہوا) (دو دن میں زمین، دو دن میں پہاڑ وغیرہ، جو شمار میں) پورے ہیں پوچھنے والوں کے لئے (یعنی ان لوگوں کے لئے جو تخلیق کائنات کی کیفیت اور کمیت کے متعلق آپ سے سوالات کرتے ہیں)

اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ نے اس آیت کا ترجمہ یوں فرمایا ہے:

> "تو کہہ، کیا تم منکر ہو اس سے جس نے بنائی زمین دو دن میں، اور برابر کرتے ہو اس کے ساتھ اوروں کو، وہ ہے رب جہان کا۔ اور رکھے اس میں بھاری پہاڑ اوپر سے، اور برکت رکھی اس کے اندر اور ٹھہرائیں اس میں خوراکیں اس کی چار دن میں۔ پورا ہوا پوچھنے والوں کو"

---

(۱) حم السجدۃ: ۱۰

اور مولانا فتح محمد جالندھری صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"کہو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا، اور (بتوں کو) اس کا مدمقابل بناتے ہو، وہی تو سارے جہان کا مالک ہے، اور اس نے زمین میں اسی کے اوپر پہاڑ بنائے، اور زمین میں برکت رکھی، اور اس میں سب سامان معیشت مقرر کیا۔ (سب) چار دن میں۔ (اور تمام) طلبگاروں کے لئے یکساں"۔

آیت کے یہ تراجم جو مختلف حضرات نے اپنے اپنے الفاظ میں فرمائے ہیں، اگر خالی الذہن ہو کر ان کو غیر جانب داری سے پڑھا جائے تو اس میں کہیں خوردبین لگا کر بھی یہ بات برآمد نہیں کی جا سکتی کہ زمین پر کسی کی شخصی ملکیت ناجائز ہے۔ لیکن جو لوگ پہلے سے ایک تصور ذہن میں جما کر قرآن کریم کے الفاظ میں اس کو زبردستی داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بعید سے بعید مفہوم بھی قرآن کریم کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ چنانچہ زمین کی شخصی ملکیت کی نفی کرنے والوں نے مولانا فتح محمد جالندھری صاحبؒ کے ترجمے کے آخری الفاظ اپنے موقف کی تائید کے لئے منتخب کر لئے، اور کہا کہ "طلبگاروں کے لئے یکساں" کا مطلب یہ ہے کہ زمین تمام انسانوں کے لئے یکساں ہے، یعنی وہ پوری انسانی برادری کی اجتماعی ملکیت ہے، اور کوئی شخص اس کا ذاتی طور پر مالک نہیں ہو سکتا۔

ان حضرات نے استدلال کے جوش میں اس بات پر بھی غور نہیں فرمایا کہ اگر بالفرض اسی آخری جملے کا وہی ترجمہ کیا جائے جو مولانا فتح محمد صاحب جالندھریؒ نے فرمایا ہے، اور اس ترجمے کا وہی مطلب لیا جائے جو یہ حضرات لے رہے ہیں (یعنی اجتماعی ملکیت) تو یہ جملہ آیت کے بالکل آخر میں آیا ہے، اور زمین کے تذکرے سے بہت دور ہے۔ اس سے متصل پہلے جس چیز کا ذکر ہے، وہ زمین نہیں، بلکہ زمین میں پیدا ہونے والا سامان معیشت، غلہ اور پھل وغیرہ ہے اور آخری جملہ اس طرح ہے کہ:

"اور اس (زمین) میں سب سامان معیشت مقرر کیا۔ (سب) چار دن میں۔ (اور تمام) طلب گاروں کے لئے یکساں"۔

لہٰذا اگر "طلبگاروں کے لئے یکساں" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اجتماعی ملکیت میں ہے تو اس کا زیادہ واضح تعلق اس "سامان معیشت" یعنی غلے اور پھل وغیرہ سے ہوگا جس کا ذکر چل رہا ہے۔ لہٰذا پھر تو یہ کہنا چاہئے کہ کوئی غلہ، کوئی پھل، کوئی میوہ کسی انسان کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ ہمیشہ اجتماعی ملکیت ہوگا، حالانکہ اشیائے صرف پر جن میں تقسیم کے بعد غلہ بھی شامل ہے، انفرادی ملکیت

سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ غور کیا جائے تو صرف یہی نکتہ اس "دلیل" کی تردید کے لئے کافی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ آیت ان یہودیوں کے سوال کے جواب میں نازل ہوئی تھی۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور انہوں نے آپؐ سے پوچھا تھا کہ آسمان اور زمین کی تخلیق کس طرح ہوئی؟ چنانچہ اس آیت میں زمین اور اس کی مخلوقات کی مدت تخلیق چار دن بیان کر کے یہ فرمایا گیا کہ سواءً للسائلین۔ اب حضرت قتادہؒ اور سدیؒ جو قرون اول کے مشہور مفسرین میں سے ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ اس جملے میں "سائلین" سے مراد وہ سوال کرنے والے ہیں جو زمین کی تخلیق کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے آئے تھے، اور اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ تخلیق زمین کی جتنی تفصیل اس آیت میں بیان کی گئی ہے، وہ ان سوال کرنے والوں کے لئے بیان کی جارہی ہے، اور ان میں سے جو شخص بھی آپؐ سے اس سلسلے میں سوال کرنے آئے، ان سب کو یہی جواب دیئے کہ یہ تخلیق پورے پورے چار دن میں ہوئی۔ (۱) حضرت مولانا تھانویؒ حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اسی تفسیر کے مطابق اسی جملے کا ترجمہ یوں فرمایا ہے کہ:

"پورے ہیں پوچھنے والوں کے لئے"

یا:

"پورا ہوا پوچھنے والوں کو"

عربی گرامر کے قاعدے سے اس تفسیر کے مطابق "سواءً" کا تعلق "اربعۃ ایام" سے ہے یعنی "پورے پورے چار دن" اور للسائلین کا تعلق ایک محذوف جملے سے ہے یعنی یہ بات پوچھنے والوں کے جواب میں بتائی جارہی ہے چنانچہ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں: (۲)

وقیدت الأیام الأربعة بقوله تعالی: سواءً فإنه مصدر مؤكد لمضمر هو صفته لأيام أي استوت سواء .... و قوله تعالی للسائلين متعلق بمحذوف وقع خبراً لمبتدأ محذوف. أي هذا الحصر في أربعة كائن للسائلين عن مدة خلق الأرض و ما فيها.

---

(۱) دیکھئے تفسیر ابن جریر طبریؒ ص ۹۴ و ۹۵ جزء ۲۴ جلد ۱۲ طبع دار الفکر۔ بیروت۔

(۲) روح المعانی ص ۱۰۱ و ۱۰۲ ج ۲۴۔

عربی قواعد اور محاورات کے اسلوب کے لحاظ سے آیت کی یہ تفسیر بلا تکلف صحیح ہے، چنانچہ مفسرین کی ایک بڑی جماعت نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

البتہ بعض حضرات مفسرین نے آیت کے ایک دوسرے معنی بھی بیان فرمائے ہیں۔ اور وہ یہ کہ "سائلین" کے معنی "طلبگار" کے ہیں اور سواءً کے معنیٰ "پورے پورے" کے ہیں۔ اور اس جملے کا تعلق "اقواتھا" سے ہے۔ اسی تفسیر کے مطابق مولانا فتح محمد جالندھری صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے آیت کے آخری حصے کا ترجمہ اس طرح فرمایا ہے کہ:

"اور اس (زمین) میں سب سامان معیشت مقرر کیا۔ (سب) چار دن میں۔ (اور تمام) طلبگاروں کے لئے یکساں"

یہاں "یکساں" کے معنی عربی محاورے کے مطابق پورے پورے کے ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں غذاؤں اور پھلوں وغیرہ کی شکل میں جو سامان معیشت مقرر فرمایا ہے وہ تمام حاجت مندوں کی ضرورت پورا کرنے میں یکساں ہے۔ یہ تفسیر حضرت جابر بن زیدؒ سے مروی ہے (۱) اور مشہور مفسر حافظ ابن کثیر رحمتہ اللہ علیہ نے اس کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی ہے:

قال ابن زید: معناه: وقدر فیہا أقواتہا فی أربعة أیام سواءً للسائلین أی علی وفق مراد من له حاجة إلی رزق أو حاجة. فإن اللہ تعالی قدر له ما هو محتاج إلیه وهذا القول یشبه ما ذکروه فی قوله تعالی: وآتاکم من کل ما سألتموه»

جابر بن زیدؒ کہتے ہیں کہ آیت قرآنی وقدر فیہا...... سواءً للسائلین کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو غذائیں پیدا فرمائیں وہ ان لوگوں کی حاجت کے مطابق پیدا فرمائیں جن کو رزق کی ضرورت ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اتنی مقدار پیدا فرمائی ہے جس کی ان کو ضرورت ہے اور اس تفسیر کے مطابق ان آیت کے معنی اس آیت کے مشابہ ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "اس نے تمہیں ہر وہ چیز دی جس کا تم نے سوال کیا"

چنانچہ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو غذائیں پیدا فرمائیں، وہ کسی مستحکم منصوبے

---

(۱) تفسیر ابن جریر طبری ج ۲۴ ص ۹۷۔

(۲) تفسیر ابن کثیر ص ۹۴ ج ۴۔

کے بغیر پیدا نہیں فرما دیں، بلکہ اس حساب سے پیدا فرمائیں کہ انسانوں اور جانوروں میں سے جن جن کو جس رزق کی ضرورت تھی، وہ ان کی ضرورت کے مطابق پیدا فرمایا۔ چنانچہ زمین میں پائے جانے والے رزق سے اس کائنات کی تمام مخلوقات جن میں انسان اور جانور سب داخل ہیں اپنی اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، اور ہر ایک کو اپنی حاجت کے مطابق سامان ملتا ہے، اس سامان کے حصول کے طریقے مختلف ہیں، کوئی زمین میں کاشت کر کے اس کا پھل حاصل کرتا ہے، کوئی خرید کر حاصل کرتا ہے، کسی کو یہ چیزیں میراث یا تحفے کے طور پر مل جاتی ہیں، کسی کو صدقے یا زکوٰۃ کے طور پر ملتی ہیں، اور کوئی (یعنی جانور) چل پھر کر اور منہ مار کر اپنی ضروریات حاصل کرتا ہے، لیکن ملتی سب کو ہیں۔

عربی زبان میں "سواءً" کے معنی جہاں "برابر" کے آتے ہیں، وہاں "پورے پورے" کے بھی آتے ہیں۔ اور اس آیت میں وہی معنی مراد ہیں، یعنی یہ غذائیں تمام حاجت مندوں کے لئے ان کی مجموعی حاجتوں کے پورے پورے مطابق ہوتی ہیں، "برابر" کے معنی یہاں اول تو اس لئے نہیں ہو سکتے کہ اس صورت میں مطلب یہ ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو غذائیں زمین میں پیدا فرمائی ہیں وہ تمام حاجت مندوں میں برابر تقسیم ہوتی ہیں۔ حالانکہ یہ بات مشاہدے کے بالکل خلاف ہے. آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ زمین کی پیداوار کائنات کے تمام انسانوں اور جانوروں کے درمیان برابر تقسیم ہوئی ہو۔ یہاں تک کہ وہ خالص اشتراکی ممالک جنہوں نے "مساوات" کا دعویٰ بڑے زور و شور سے کیا تھا، ان میں بھی کبھی ایک دن کے لئے بھی ایسا نہیں ہوا کہ تمام انسانوں کو برابر غذا ملی ہو۔ اور ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی طرف ایسی بات کی نسبت نہیں کی جا سکتی جو مشاہدے کے سراسر خلاف ہو۔

اس آیت میں "برابر" کے معنی مراد نہ لے سکنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت نے اس بات کی صراحتاً نفی فرما دی ہے کہ وسائل معاش تمام انسانوں میں برابر تقسیم ہوتے ہیں چنانچہ سورۂ زخرف میں ارشاد ہے۔

نحن قسمنا بینہم معیشتہم فی الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضہم فوق بعض درجت لیتخذ بعضہم بعضا سخریا و رحمۃ ربك خیر مما یجمعون.

ہم نے ان کے درمیان دنیوی زندگی میں ان کے سامان معیشت کو تقسیم کیا ہے. اور ان میں بعض کو بعض دوسروں پر کئی درجے فوقیت دی ہے. تاکہ ان میں سے

(۱) الزخرف: ۳۲۔

ایک دوسرے سے کام لے سکے۔ اور آپ کے پروردگار کی رحمت اس چیز سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کرتے ہیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے غیر مبہم الفاظ میں یہ بات واضح فرمادی ہے کہ معیشت کی تقسیم میں اس نے سب کو برابر دینے کا اہتمام نہیں فرمایا، بلکہ اپنی حکمت بالغہ سے اپنے بندوں کے درمیان مدارج قائم فرمائے ہیں، کسی کو کم دیا گیا ہے. کسی کو زیادہ. اور اس کی حکمت و مصلحت وہی جانتا ہے۔ جس نے انسان کو پیدا کیا، اور جو ان کی ضروریات. ان کے مزاج و مذاق، ان کی طبعی اور نفسیاتی کیفیات. غرض ہر چیز سے پوری طرح باخبر ہے. اور جب یہ بات سورۂ زخرف کی اس آیت میں غیر مبہم طریقے سے بیان فرمادی گئی تو "سواءً للسائلین" کا یہ مطلب کیسے ہو سکتا ہے کہ زمین کی پیداوار تمام انسانوں میں برابر برابر تقسیم کی گئی ہے؟

ایک اصولی بات

بس یہ ہیں قرآن کریم کی وہ چند آیتیں جن کو عام طور سے زمین کی شخصی ملکیت کے خلاف بطور استدلال پیش کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک آیت کا وہ مطلب پیچھے بیان کر دیا گیا ہے۔ جو عربی زبان کے قواعد و اسالیب اور قرآن کریم کے طرز بیان کے عین مطابق بھی ہے. اور چودہ سو سال سے تمام مفسرین امت نے ان آیتوں کا یہی مطلب سمجھا ہے. اور کسی فرد واحد نے بھی ان آیتوں سے یہ نہیں سمجھا کہ ان سے زمین کی شخصی ملکیت کی نفی مقصود ہے۔

لیکن فرداً فرداً تینوں آیتوں سے استدلال کا جواب الگ الگ معلوم کرنے کے بعد ایک اہم بات اصولی طور پر یہ قابل غور ہے کہ ان تینوں آیتوں میں سے کوئی آیت بھی براہ راست ملکیت کے مسئلے کو بیان کرنے کے لئے نازل نہیں ہوئی۔ تینوں آیتوں میں موضوع گفتگو کچھ اور ہے۔ پہلی آیت میں فرعون کے بلند بانگ دعوؤں کی تردید مقصود ہے. دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے وہ احسانات بیان فرما رہے ہیں جو انہوں نے اپنے بندوں پر فرمائے ہیں۔ اور اس ضمن میں کائنات کے اندر پھیلی ہوئی مختلف نعمتوں کا تذکرہ مقصود ہے. تاکہ ان کا تصور کر کے بندے اس کا شکر بجالائیں۔ اور تیسری آیت میں آسمان و زمین کی تخلیق کی مدت وغیرہ کا ذکر مقصود ہے۔ ان میں سے کوئی بھی آیت ایسی نہیں ہے جس کا مرکزی موضوع ملکیت کے مسئلے یا اس کے فلسفے کو بیان کرنا ہو۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ عرب کے جس معاشرے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے. اور جس میں قرآن کریم نازل ہوا. اس میں زمین پر انفرادی ملکیت کو ایک مسلم اصول

کے طور پر اختیار کیا گیا تھا. عرب کے تمام قبائل اسی انفرادی ملکیت کی بنیاد پر زمینوں کا بندوبست کرتے آرہے تھے. صدیوں سے زمین کی خرید و فروخت اور اس کو کرائے یا مزارعت پر دینے کا عام رواج تھا۔ قبائلی قانون کے تحت کسی شخص کی مملوکہ زمین پر دست درازی غصب سمجھی جاتی تھی۔ غرض جو شخص زمین کا مالک ہوتا۔ اس کو ملکیت کے تمام حقوق دیئے جاتے تھے۔ انفرادی ملکیت کا یہ ادارہ صدیوں سے اس قدر مستحکم تھا کہ اسے ختم کرنا کوئی معمولی کام نہیں تھا. یہ اتنا انقلابی کام تھا کہ اس کے لئے ذہن تیار کرنے اور اس پر لوگوں کو آمادہ کرنے کے لئے بڑی جدوجہد اور بڑے وقت کی ضرورت تھی۔ اگر واقعتاً قرآن کریم کا منشا یہ تھا کہ "انفرادی ملکیت" کا یہ ادارہ جڑ مول سے ختم کر دیا جائے تو کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ اتنے زبردست انقلابی حکم کے لئے کوئی ایک بھی صریح آیت نازل نہ کی جائے بلکہ دوسرے موضوعات کے ضمن میں اس انقلابی حکم کو اتنے غیر اہم انداز سے اور ایسے مشتبہ الفاظ میں بیان کیا جائے کہ اس کو آیت کے الفاظ سے کشید کرنے کے لئے محنت کرنی پڑے، اور پھر بھی امت کی اکثریت یہی کہتی رہے کہ ان الفاظ کا مطلب وہ نہیں ہے جو ان سے کشید کیا جارہا ہے؟ کیا صدیوں سے معاشرے میں جمی اور بیٹھی ہوئی عادتوں کو ختم کرنے کا انقلابی حکم اسی طرح دیا جاتا ہے؟

اہل عرب کی سب سے بنیادی خرابی بت پرستی تھی، جو ان کی رگ وپے میں سرایت کر گئی تھی، قرآن کریم نے اس کو ختم فرمانا چاہا سو اس کے خلاف اتنی کثرت سے آیتیں نازل فرمائیں کہ ان کا شمار مشکل ہے، اور بت پرستی کی قباحتیں اتنے مختلف طریقوں سے بیان فرمائیں کہ اس بات میں کوئی ادنیٰ اشتباہ نہ رہا کہ قرآن کریم بت پرستی کا مخالف ہے۔

شراب اہل عرب کی زندگی کا ایک لازمی جزء بن کر رہ گئی تھی. جب قرآن کریم نے اس برائی کو ختم فرمانا چاہا تو غیر مبہم اور صریح الفاظ میں اس سے پرہیز کرنے کی تاکید اس طرح فرمائی کہ اسکا کوئی دوسرا مطلب نکالنا ممکن ہی نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر "زمین کی شخصی ملکیت" کو بھی قرآن کریم ختم کرنا چاہتا تھا. تو کیا اتنا عظیم انقلابی حکم اس بات کا بھی مستحق نہیں تھا کہ اسے کم از کم کسی ایک جگہ باقاعدہ موضوع بنا کر صریح الفاظ میں ذکر کیا جائے.

میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص بھی اس نکتے پر انصاف کے ساتھ غور کرے گا. وہ اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکال سکتا کہ درحقیقت قرآن کریم نے زمین کی شخصی ملکیت کا ارادہ ختم نہیں فرمایا۔ اور جن آیتوں سے کھینچ تان کر مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا۔

پھر اگر بالفرض قرآن کریم نے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کی شخصی ملکیت کو ختم فرمایا ہوتا تو یہ انقلابی حکم اپنے ساتھ بیشمار مسائل لے کر آتا۔ شخصی ملکیت کو ختم کرنے کا طریق کار کیا ہو گا؟ جو لوگ اس وقت زمینوں کے مالک ہیں، ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ اگر ان سے زمینیں زبردستی چھینی جائیں گی تو ان کو معاوضہ ادا کیا جائے گا یا نہیں؟ معاوضہ ہو گا تو کس بنیاد پر ہو گا؟ شخصی ملکیت کو ختم کرنے کے بعد زمینوں سے فائدہ اٹھانے اور پیداوار حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہو گا؟ اگر لوگوں میں کاشت کے لئے زمینیں تقسیم کی جائیں گی تو یہ تقسیم کس بنیاد پر اور کس حساب سے ہو گی؟ ایک شخص کو کتنا رقبہ زمین کاشت کے لئے دیا جائے گا؟ حاصل ہونے والی پیداوار پر اس کو مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے یا نہیں؟ ہوں گے تو کن ضابطوں کے ماتحت ہوں گے؟ غرض اس قسم کے بیشمار مسائل ہیں جن کا مفصل واضح اور غیر مبہم جواب مہیا کئے بغیر زمین کی شخصی ملکیت کا خاتمہ قطعی طور پر ناممکن ہے۔ اگر قرآن و سنت نے واقعتاً شخصی ملکیت کا خاتمہ کیا ہوتا تو ممکن نہیں تھا کہ وہ اس قسم کے مسائل کا واضح حل مہیا نہ کریں۔ ایسی صورت میں قرآن و سنت ان مسائل کے جوابات سے لبریز ہونے چاہئے تھے۔

لیکن قرآن و سنت کے وسیع ذخیرے میں ان میں سے کسی مسئلے کا کوئی حل تو کجا، اس کا بحیثیت مسئلے ادنیٰ ساذکر بھی نہیں ملتا۔ بلکہ اس کے خلاف ایسے بیشمار احکام ملتے ہیں جن میں زمین کی شخصی ملکیت کو واضح طور پر تسلیم کیا گیا ہے، (چنانچہ پچھلے باب میں ان احکام کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ اور کچھ مزید مثالیں آگے آ رہی ہیں)۔

اب یہ عجیب و غریب معاملہ ہے کہ زمین کی شخصی ملکیت کے خاتمے جیسا انقلابی حکم جس کے دامن میں مسائل کا ایک جہان آباد ہے اس کا قرآن و سنت نے کہیں بھی کوئی واضح ذکر نہیں فرمایا۔ اور یہ سارا انقلاب آیات۔ قدرت کے ضمن میں ایک مشکوک سے اشارے کے ذریعے لے آیا گیا ہے، نہ اس سے پہلے اس انقلابی حکم کی کوئی تمہید ہے، نہ اس کے بعد پیدا ہونے والے مسائل سے کوئی تعرض کیا گیا ہے! کیا کوئی شخص اپنے ہوش و حواس کی سلامتی کے ساتھ قرآن کریم اور اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کی طرف ایسی بے ہنگم بات منسوب کر سکتا ہے؟

زمین بھائی کو دے دو

بعض حضرات نے زمین کی شخصی ملکیت کی نفی کے لئے ایک حدیث کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے۔ یہ حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اور اس کے جن الفاظ سے استدلال کی کوشش کی گئی ہے، وہ یہ ہیں:

من كانت له أرض فليزرعها ۔ أو ليمنحها أخاه

جس شخص کی کوئی زمین ہو اسے چاہئے کہ وہ اس میں کاشت کرے. یا اپنے بھائی کو دے دے۔

کہا جاتا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر ذاتی ملکیت ہوتی تو یہ حکم نہ دیا جاتا کہ خود کاشت نہ کرنے کی صورت میں وہ اپنے بھائی کو دے دی جائے۔

لیکن اس حدیث سے ذاتی ملکیت کی نفی پر استدلال اس قدر بے بنیاد ہے کہ اس سے زیادہ بے بنیاد استدلال کا تصور مشکل ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حدیث شخصی ملکیت کے خلاف تو کیا ہوتی؟ ذرا سا غور کیا جائے تو یہ شخصی ملکیت کا ناقابل انکار ثبوت مہیا کرتی ہے. جس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) اول تو حدیث کے مکمل الفاظ یہ ہیں

من كانت له أرض فليزرعها ۔ أو ليمنحها أخاه ۔ فإن لم يفعل فليمسك أرضه

"جس شخص کی کوئی زمین ہو اسے چاہئے کہ وہ اس میں کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دے دے. اور اگر یہ بھی نہ کرے تو اپنی زمین اپنے پاس رکھے"

اب استدلال کرنے والے کرتے یہ ہیں کہ حدیث کا صرف پہلا جملہ نقل کر دیتے ہیں. اور آخری خط کشیدہ جملہ حذف کر جاتے ہیں۔ کیونکہ اس جملے سے حدیث کا صحیح مطلب فوراً واضح ہو جاتا ہے. اور وہ یہ کہ دوسرے بھائی کو دینا کوئی فرض یا واجب نہیں ہے. بلکہ مسلمانوں میں بھائی چارے کی فضا قائم کرنے کی خاطر یہ ترغیب دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زمین کے کسی حصے پر خود کاشت نہ کر سکے تو بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے کسی دوسرے بھائی کو کاشت کے لئے دے دے. لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ کہیں اس حکم کو فرض یا واجب نہ سمجھ لیا جائے. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر میں خود یہ وضاحت فرما دی کہ ایسا کرنا اس کے ذمے فرض یا واجب نہیں ہے. چنانچہ اگر وہ اپنی زمین کسی اور کو نہ دے اور خود اپنے پاس ہی رہنے دے تو ایسا کرنا بھی جائز ہے۔

اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپؐ نے کتنی باریک بینی سے شخصی ملکیت کے اصول کا تحفظ فرمایا کہ اصل مقصد اس بات کی ترغیب دینا تھا کہ لوگ اپنی

فاضل زمینیں ضرورت مند افراد کو کاشت کے لئے مستعار دے دیا کریں. چنانچہ آپ ؐ نے اس کی ترغیب بھی دی. لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کا خاص اہتمام بھی فرمایا کہ اس حکم کو فرض یا واجب نہ سمجھ لیا جائے. اور اس سے ملکیت کے شرعی حقوق مجروح نہ ہوں. چنانچہ اس معاملے میں ہر چھوٹے سے چھوٹے شک کو زائل کرنے کے لئے یہ بھی فرما دیا کہ "اگر یہ بھی نہ کرے تو اپنی زمین اپنے پاس رکھے"۔

(۲) اس حدیث کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں کہ:

من کانت له أرض

جس شخص کی کوئی زمین ہو

یہ الفاظ بذات خود اس بات کو تسلیم کرنے پر مبنی ہیں کہ زمین کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں آ سکتی ہے۔ کیونکہ "کسی شخص کی زمین" کا بدیہی مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کی مملوکہ زمین۔ خاص طور پر عربی زبان میں لفظ "له" استعمال کیا گیا ہے جس میں حرف "لام" ملکیت ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا زیادہ صحیح ترجمہ یہ ہو گا کہ "جس شخص کی ملکیت میں کوئی زمین ہو" یہ زمین کی شخصی ملکیت کا واضح ثبوت نہیں تو اور کیا ہے؟

(۳) پھر بھائی کو دینے کے لئے جو الفاظ حدیث میں استعمال کئے گئے ہیں. وہ ہیں:

" فَلْيَمْنَحْهَا اخاه "۔ یہ الفاظ عربی زبان میں کسی کو کوئی چیز مستقل طور پر دینے کے لئے نہیں. بلکہ عاریہ دینے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی کسی شخص کو کوئی چیز عارضی استعمال کے لئے دینا جس کے بعد اس پر واجب ہے کہ وہ دوبارہ اصل مالک کو واپس کر دے۔ چنانچہ عربی لغت کے مشہور عالم علامہ ابن سیدہ ؒ لکھتے ہیں:

منحه الشاة و الناقة ... أعاده إياها

(عرب کہتے ہیں) منحه الشاة والناقة: یعنی بکری یا اونٹنی اس کو عاریۃً دے دی۔

اور مشہور لغوی ابن فارس ؒ لکھتے ہیں:

«والمنيحة: منيحة اللبن، كالناقة أو الشاة يعطيها الرجل آخر يحتبلها ثم يردها»

---

(۱) المحکم. لابن سیدہ ص ۲۹۷ ج ۳

(۲) معجم مقاییس اللغۃ. لابن فارس ص ۲۷۸ ج ۵۔ مزید دیکھئے تاج العروس ص ۲۳۳ ج ۲۔

منیحہ عربی میں اس جانور کو کہتے ہیں جو دودھ کے لئے مستعار دیا گیا ہو مثلاً کوئی شخص اپنی بکری یا اونٹنی دوسرے کو اس لئے دے دے کہ وہ دودھ دوھ کر اسے واپس کر دے۔

اور ایک حدیث میں بھی یہ لفظ صراحتاً عاریت کے لئے استعمال ہوا ہے. چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«المنحة مردودة»

" منحہ " (عاریت) کا واپس کرنا ضروری ہے

اور صحیح مسلم² میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہی حدیث ایک اور طریق میں ان الفاظ سے بھی مروی ہے:

من كانت له أرض فليهبها أو ليعرها»

جس شخص کی کوئی زمین ہو. اسے چاہئے کہ وہ یا تو اس کا ہبہ کر دے یا اسے عاریۃً دے دے۔

اس لئے مشہور محدث اور لغوی امام ابو عبید³ فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث میں " منح " کے معنی عاریۃً دینے ہی کے ہیں۔ امام ابو عبید کے الفاظ یہ ہیں:

من كانت له أرض فليزرعها أو ليمنحها أخاه أي يدفعها إليه حتى يزرعها فإذا رفع زرعها ردها إلى صاحبها»

یہ جو حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ " جس شخص کی کوئی زمین ہو. وہ اس میں کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دے دے. اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے کاشت کرنے کے لئے دے دے. چنانچہ جب وہ اپنی فصل اٹھا چکے تو زمین اس کے اصلی مالک کو واپس کر دے

ان حوالوں سے یہ بات ناقابل انکار طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بھائی کو زمین دینے کی جو ترغیب دی ہے. اس کا مطلب عارضی استعمال کے لئے دینا ہے. جس کے بعد وہ پھر اصل مالک کے پاس آئے گی۔ اور واپسی کی یہ شرط صاف بتا رہی ہے کہ وہ زمین

(۱) اخرجہ البزار عن انس² (الفتح الکبیر. للنبہانی ص۲۵۹ ج ۳)

(۲) صحیح مسلم. کتاب المساقاۃ. باب کراء الارض۔

(۳) لسان العرب ص۴۴۶ ج ۳) ۔

مستعار دینے والے کی ملکیت میں ہے. اور اسے اس پر پورے مالکانہ حقوق حاصل ہیں۔
اور اگر بالفرض یہاں "منح" کے معنی ہبہ کرنے کے لئے بھی لئے جائیں. کیونکہ ہبہ ایسی چیز کا درست ہوتا ہے جو ہبہ کرنے والے کی ملکیت میں ہو. اگر میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوں تو میں اس کا ہبہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس صورت میں بھی یہ حدیث زمین پر شخصی ملکیت کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے۔ لہٰذا اس سے الٹا ملکیت زمین کی نفی پر استدلال کرنا اگر عناد پر نہیں تو حدیث کے الفاظ. عربی زبان اور اس کے محاورات سے شدید ناواقفیت پر ضرور مبنی ہے۔

مزارعت کا مسئلہ

بعض حضرات زمین کی شخصی ملکیت کے خلاف وہ احادیث بھی پیش کرتے ہیں جن میں مزارعت سے منع کیا گیا ہے۔ چونکہ مزارعت کے جواز یا عدم جواز کا مسئلہ بذات خود بھی فی الجملہ اہمیت کا حامل ہے. اس لئے اس باب میں ہم مختصراً اس مسئلے کی حقیقت واضح کرنا بھی مناسب سمجھتے ہیں۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم مزارعت کے موضوع پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپؐ کے طرز عمل کی تشریح کریں۔ چند باتیں تمہید کے طور پر سمجھ لینی ضروری ہیں

(۱) سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ "مزارعت" کا مطلب یہ ہے کہ کوئی زمین کا مالک اپنی زمین دوسرے شخص کو اس شرط پر کاشت کے لئے دے کہ وہ پیداوار کا کچھ حصہ زمین کے استعمال کے عوض مالک کو ادا کرے گا۔ اگر پیداوار کا کوئی حصہ کاشتکار کے ذمے لازم کر دیا جائے تو اسے عربی میں "مزارعہ" یا "مخابرہ" کہا جاتا ہے۔ اور اگر یہی معاملہ باغات اور درختوں میں کیا جائے تو اسے عربی زبان میں "مساقاۃ" یا "معاملہ" کہتے ہیں۔ اور اردو میں "مزارعت" یا "مساقات" کو "بٹائی" بھی کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر مالک زمین کاشت کار کو زمین دیتے وقت پیداوار کا کوئی حصہ طے کرنے کے بجائے زمین کا کرایہ نقدی کی صورت میں مقرر کر لے تو اسے عربی میں "کراء الارض" یا "اجارہ" کہتے ہیں. اور اردو میں "کرایہ پر دینے" یا "ٹھیکے پر دینے" سے تعبیر کرتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی عربی زبان میں "کراء الارض" کے لفظ مزارعت کے لئے بھی استعمال کر لیا جاتا ہے. جیسا کہ انشاء اللہ آگے اس کی مثالیں آئیں گی۔

(۲) "مزارعت"، "مساقات" اور "اجارہ" تینوں طریقے زمانہ جاہلیت سے عربوں میں معروف چلے آتے تھے. اور ان پر بے کھٹکے عمل ہوتا تھا۔ لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان طریقوں میں کچھ اصلاحی تبدیلیاں فرمائیں. ان کی بعض صورتوں کو ناجائز قرار دیا. بعض کو جائز رکھا. بعض احکام وجوبی انداز (Mandatory nature) کے دیئے۔ اور بعض احکام مشورے. نصیحت اور بھائی چارے کی بنیاد پر عطا فرمائے۔

(۳) احادیث نبویہؐ کا جو عظیم الشان ذخیرہ الحمدللہ ہمارے پاس موجود ہے. اس سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ احادیث اس طرح مدون نہیں ہوئیں کہ کسی ایک صحابی نے کسی ایک موضوع کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات کو یکجا کر کے اس موضوع کے تمام پہلوؤں کے بارے میں ایک جامع و مانع و کتاب مرتب کر دی ہو۔ بلکہ حضرات صحابہ کرامؓ نے جس سادگی کے ساتھ احادیث سنیں. اسی سادگی کے ساتھ اپنے شاگردوں کی طرف منتقل فرمائیں. بسا اوقات یہ بھی ہوا کہ جس خاص موضوع کے بارے میں گفتگو چل رہی ہو. کسی حدیث کا صرف وہ حصہ اس وقت نقل فرمایا جو اس موضوع سے متعلق تھا. اور دوسرا حصہ موضوع گفتگو سے غیر متعلق ہونے کی بناء پر اس وقت بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

لہٰذا جب کسی موضوع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا اور اس کی صحیح تشریح معلوم کرنا ہو تو یہ طرز عمل انتہائی غلط اور گمراہ کن ہو گا کہ صرف کسی ایک یا دو حدیثوں کو دیکھ کر کوئی عمومی رائے قائم کر لی جائے۔ اس کے بجائے یہ ضروری ہے کہ اس موضوع پر جتنی احادیث مختلف صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں. ان سب کو بیک وقت سامنے رکھ کر مسئلے کی حقیقت معلوم کی جائے۔ اس وقت واضح طور پر یہ منظر نظر آئے گا کہ ایک حدیث دوسری حدیث کی تشریح کر رہی ہے. یا اس کا تکملہ بن رہی ہے. اور تمام احادیث کو ایک دوسری کے پس منظر میں دیکھنے سے موضوع کے بارے میں مربوط اور منظّم احکام سامنے آ جاتے ہیں۔

(۴) اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ کسی موضوع کی ٹھیٹھ فقہی اور قانونی اصطلاحات جو ایک قانونی مفہوم کے ساتھ خاص ہوں. اس دور میں متعین ہوئی ہیں جب "فقہ" نے ایک مستقل علم و فن کے باضابطہ صورت اختیار کی۔ اس سے پہلے وہ اصطلاحات اتنی متعین نہیں تھیں کہ ان میں کسی اور معنی کا احتمال ہی نہ ہو۔

ان چار امور کو مدنظر رکھتے ہوئے زیر بحث مسئلے کی طرف آیئے۔ جو حضرات مزارعت یا زمین کے کرائے پر دینے کو ناجائز کہتے ہیں۔ وہ مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ یہ احادیث صحیح بخاری میں بھی مروی ہیں. لیکن میں یہاں صحیح مسلم سے نقل کر رہا ہوں:

عن جابر بن عبداللہ أن رسول اللہ ﷺ نہی عن کراء الأرض

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "کراء الارض" (زمین کو کرائے پر دینے) سے منع فرمایا۔

عن جابر أن النبی ﷺ نہی عن المخابرۃ

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ (مزارعت) سے منع فرمایا۔

یہی مضمون حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ یعنی انہوں نے بھی یہ ارشاد فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "کراء الارض" اور "مخابرہ" سے منع فرمایا ہے۔

جو چار تمہیدی باتیں اوپر عرض کی گئی ہیں، اگر ان سے قطع نظر کر کے صرف ان دو چار احادیث کو سامنے رکھا جائے تو بیشک ان سے نتیجہ یہی نکلے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو کرائے پر دینے سے بھی منع فرمایا ہے، اور بٹائی پر دینے سے بھی۔ لیکن اگر اس موضوع کی تمام احادیث، اور خود حضرت جابرؓ اور حضرت رافع بن خدیجؓ کی ان روایات کو بھی سامنے رکھا جائے جن میں خود انہوں نے اس ممانعت کی تفصیل بیان فرمائی ہے اور جو مذکورہ مختصر احادیث کے لئے تکملہ کی حیثیت رکھتی ہیں، تو حقیقت حال واضح ہو جاتی ہے۔ ان تمام احادیث کو مجموعی طور پر سامنے رکھنے سے جو صورت حال سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں کسی دوسرے شخص کو کاشت کے لئے زمین دینے کی چند صورتیں ہوتی تھیں:

عہد رسالتؐ میں مزارعت کے مختلف طریقے

(۱) ایک شخص کے پاس اگر کوئی فاضل زمین ہوتی جسے وہ خود آباد نہ کر سکتا تو وہ کسی دوسرے شخص کو عاریۃً کسی اجرت یا معاوضے کے بغیر زمین دے دیتا، تاکہ وہ اس میں کاشت کر کے پیداوار سے اپنی روزی حاصل کرے۔

یہ طریقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ پسند تھا، کیونکہ دوسرے کی ہمدردی، خیر خواہی اور ایثار کی جو صفات اسلام اپنے متبعین میں دیکھنا چاہتا ہے، یہ طریقہ ان صفات کے شایان شان ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے کو اختیار کرنے کی بہت ترغیب دی، اور پچھلے باب میں حضرت رافع بن خدیجؓ کی جو حدیث گزر رہی ہے، وہ اسی ترغیبی ہدایت پر مبنی ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص اپنی زمین دوسرے کو نقد کرایہ پر دیدیتا تھا. کرایہ دار زمین کی کل پیداوار کا خود مالک ہوتا. اور مالک زمین کو متعینہ کرایہ نقدی کی شکل میں ادا کر دیتا۔ اس طریقے کو پہلے طریقے کے مقابلے میں زیادہ پسند تو نہیں کیا گیا. لیکن اسے ناجائز بھی قرار نہیں دیا گیا۔

(۳) تیسرا طریقہ یہ تھا کہ زمیندار کاشتکار کو زمین دیتے وقت پیداوار کا فی صد حصہ مثلاً تہائی. چوتھائی یا آدھا اپنے لئے طے کر لیتا. اور باقی کاشتکار کا ہوتا. اس طریقے کو بھی پہلے طریقے کے مقابلے میں پسندیدہ تو نہیں قرار دیا گیا. لیکن ناجائز بھی نہیں کہا گیا۔ بلکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مقامات (مثلاً خیبر میں) خود بھی یہ طریقہ اختیار فرمایا۔

(۴) چوتھا طریقہ یہ تھا کہ زمیندار پیداوار کا فی صد حصہ طے کرنے کے بجائے پیداوار کی کوئی مخصوص مقدار (مثلاً دس من بیس من) اپنے لئے طے کر لیتا اور کاشتکار کو ہر حالت میں یہ مقدار زمیندار کو دینی پڑتی. خواہ کل پیداوار کتنی کم کیوں نہ ہوئی ہو. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے کی سختی کے ساتھ ممانعت فرمائی۔ وجہ یہ تھی کہ اگر زمیندار نے بیس من پیداوار اپنے لئے طے کر لی. تو بعض اوقات کل پیداوار ہی بیس من ہوتی. وہ ساری پیداوار زمیندار لے جاتا. اور کاشتکار کو اپنی محنت کا کوئی صلہ نہ ملتا۔ یا بعض اوقات زمیندار کی طے شدہ مقدار دینے کے بعد کاشتکار کے پاس اتنی کم پیداوار بچتی جو اس کی محنت کا مناسب صلہ نہ ہوتی۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے کو بالکل ناجائز و حرام قرار دیا۔

(۵) پانچواں طریقہ یہ تھا کہ زمیندار کاشتکار کو زمین دیتے وقت اس زمین کا زیادہ زرخیز حصہ اپنے لئے مخصوص کر کے یہ کہتا کہ اس حصے پر جو پیداوار ہو گی. وہ میری ہو گی. اور دوسرے حصے کی پیداوار تمہیں لینی ہو گی اب بسا اوقات ایسا ہوتا کہ زمیندار کے حصے کی زمین سے تو خوب پیداوار بر آمد ہوتی. اور کاشتکار والے حصے میں یا تو کچھ پیدا نہ ہوتا. یا کم پیدا ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقے کو بھی بالکلیہ ممنوع قرار دیدیا۔

یہ آخری دو طریقے زمانہ جاہلیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اتنی کثرت کے ساتھ رائج تھے کہ جب مطلق "مزارعت"، "مخابرہ"، یا کراء الارض کا لفظ بولا جاتا تو اکثر انہی دو طریقوں کی طرف ذہن جاتا تھا۔ اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں طریقوں کو منع فرما دیا تھا. اس لئے صحابہ کرامؓ نے ایسے مواقع پر جہاں تفصیل کا موقع نہیں تھا. یا اس کی ضرورت نہیں تھی. ان دو طریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صرف اتنا ارشاد فرما

دیا کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کراء الارض سے منع فرمایا" یا "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت سے منع فرمایا"۔ یہی صورت حضرت جابرؓ اور حضرت رافع بن خدیجؓ کی مذکورہ بالا احادیث میں پیش آئی ہے۔ ورنہ انہی دو بزرگوں نے دوسرے مواقع پر جہاں اس حکم کی تفصیل بیان فرمائی، وہاں بات کو بالکل واضح کر دیا کہ درحقیقت ممانعت ان آخری دو طریقوں کی تھی، پہلے دو طریقوں کی نہیں.

حضرات رافع بن خدیجؓ کی توضیحات:

چنانچہ جب ان حضرات سے ممانعت کی تفصیل معلوم کی گئی، تو انہوں نے تفصیل کے ساتھ حقیقت واضح فرما دی۔ چنانچہ وہی حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ جنہوں نے کسی موقع پر "کراء الارض" کے بارے میں یہ کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے، انہی کے بارے میں حنظلہ بن قیسؒ کہتے ہیں کہ:

سألت رافع بن خديج عن كراء الأرض بالذهب و الورق فقال : لا بأس به إنما كان الناس يؤاجدون على عهد النبي ﷺ على الماذيانات و أقبال الجلاول و أشياء من الزرع ، فيهلك هذا و يسلم هذا ، و يسلم هذا و هلك هذا ، فلم يكن للناس كراء إلا هذا فلذلك زجر عنه فأما شيئ معلوم مضمون فلا بأس به.

> میں نے رافع بن خدیج (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا کہ زمین کو سونے چاندی کے عوض کرائے پر دینے کا کیا حکم ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگ زمین اس طرح کرائے پر دیتے تھے کہ پانی کی گزرگاہوں اور نالیوں کے سامنے والے حصوں پر یا کھیتی کے کسی خاص حصے میں اگنے والی پیداوار اپنے لئے طے کر لیتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کبھی زمین کے اس حصے کی پیداوار تباہ ہو جاتی، اور دوسرے حصے کی سلامت رہتی، اور کبھی اس حصے کی سلامت رہتی اور دوسرے کی تباہ ہو جاتی۔ اس وقت لوگوں میں زمین کرائے پر دینے کا یہی طریقہ تھا۔ اس

(۱) صحیح مسلم۔ کتاب البیوع، باب کراء الارض

لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا، لیکن اگر کسی متعین اور خطرے سے خالی چیز کو مقرر کیا جائے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ (۱)

ایک اور موقع پر حضرت رافع بن خدیجؓ نے یہ وضاحت فرمائی

کنا نکری الأرض علی أن لنا ھذہ ولھم ھذہ فربما أخرجت ھذہ ولم تخرج ھذہ فنہانا عن ذلک. وأما الورق فلم ینہنا

ہم زمین کو اس طرح کرائے پر دیا کرتے تھے کہ اس زمین کی پیداوار ہماری ہوگی، اور اس زمین کی پیداوار ان کی ہوگی، اب بعض اوقات اس زمین میں پیداوار ہوتی، اور اس میں نہ ہوتی چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس طریقے سے منع فرما دیا، لیکن نقدی پر زمین دینے سے منع نہیں فرمایا (۲)

ایک اور موقع پر حضرت رافع بن خدیجؓ سے صاف طور پر پوچھا گیا کہ جس "کراء الارض" سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، وہ کس قسم کا معاملہ ہے؟ تو آپ نے ممنوع صورتوں کی تفصیل بیان فرما دی۔ سنن نسائیؒ میں امام زہریؒ فرماتے ہیں:

"أن رافع بن خدیج قال: نہی رسول اللہ ﷺ عن کراء الأرض. قال ابن شہاب: فسئل رافع بعد ذلک. کیف کانوا یکرون الأرض؟ قال: بشیئ من الطعام مسمی وبشرط أن لنا ما تنبت ماذیانات الأرض وأقبال الجداول"

رافع بن خدیجؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "کراء الارض" سے منع فرمایا۔ ابن شہاب زہریؒ کہتے ہیں کہ بعد میں رافعؓ سے پوچھا گیا کہ اس دور میں لوگ زمین کو کس طرح کرائے پر دیا کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ: غلہ کی معین مقدار پر اور اس شرط پر کہ پانی کی گزرگاہوں، اور نالیوں کے سامنے والے حصوں پر جو پیداوار ہوگی، وہ ہماری ہوگی"۔

ان احادیث سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگ جو زمینیں کرائے یا مزارعت پر دیتے تھے، عموماً وہ مذکورہ پانچ طریقوں سے آخری دو طریقوں کے مطابق دیا کرتے تھے، یعنی یا تو پیداوار کی معین مقدار (مثلاً دس من یا بیس

---

(۱) سنن النسائی، کتاب المزارعۃ، باب فی النہی عن کراء الارض بالثلث والربع، حدیث نمبر ۳۲۰۷۔

من) مقرر کر لیتے تھے. ان دونوں صورتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا. کیونکہ اس میں احتمال تھا کہ طے کی ہوئی پیداوار کے سوا کچھ پیدا نہ ہو. یا صرف طے کی ہوئی زمین میں پیداوار ہو. باقی میں نہ ہو. اور اس طرح ایک فریق نقصان میں رہے۔ چنانچہ مزارعت کی یہ دو صورتیں باجماع ناجائز ہیں. انہیں کوئی جائز نہیں کہتا۔

حضرت جابرؓ کی وضاحت.

اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ جن کی حدیث اوپر نقل کی گئی ہے. اور جس سے. زمین کو کرائے یا مزارعت پر دینے کے خلاف استدلال کیا جاتا ہے. انہوں نے بھی ایک دوسرے موقع پر اس ممانعت کی حقیقت ان الفاظ میں واضح فرمائی:

كنا في زمان رسول الله ﷺ نأخذ الأرض بالثلث أو الربع بالماذيانات. فقام رسول الله ﷺ في ذالك. فقال من كانت له أرض فليزرعها فإن لم يزرعها. فليمنحها أخاه. فإن لم يمنحها أخاه فليمسكها.

> ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زمین اس شرط کے ساتھ لیا کرتے تھے۔ کہ پانی کی گذرگاہوں پر جو پیداوار ہو گی اس کا ایک تہائی یا ایک چوتھائی زمیندار کو دینا ہو گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں اقدام فرمایا. اور ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جس شخص کی کوئی زمین ہو. اسے چاہئے کہ وہ خود اس میں کاشت کرے. اگر وہ خود کاشت نہیں کرتا تو اسے چاہئے کہ اپنے بھائی کو مستعار دے دے. اگر بھائی کو مستعار بھی نہیں دیتا تو اپنے پاس رکھے (مگر مذکورہ طریقے سے کرائے پر نہ دے)

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا.

كنا نخابر على عهد رسول الله ﷺ. فنصيب من القصري و من كذا. فقال رسول الله ﷺ من كانت له أرض فليزرعها فليدعها

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مخابرہ (مزارعت) کیا کرتے تھے.

---

(۱) صحیح مسلم. کتاب البیوع. باب کراء الارض۔

(۱) صحیح مسلم. کتاب البیوع. باب کراء الارض۔

تو ہمیں قصری (خوشوں میں بچا ہوا غلہ) وغیرہ مل جاتا تھا. اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی کوئی زمین ہو، وہ اسے خود کاشت کرے. الخ

قصری (یعنی خوشوں میں بچے ہوئے غلے) کے ملنے کا کیا مطلب ہے؟ علامہ زمخشری جو عربی لغت کے مشہور عالم ہیں اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ان رب الأرض كان يشترط على المزارع أن يزرع له خاصة ما تسقيه الجداول و الربيع ، و أن تكون له القصارة ، فنهى عن ذلك.

زمیندار کاشتکار سے یہ طے کرتا تھا کہ کاشتکار اس کے لئے زمین کا وہ مخصوص حصہ کاشت کرے گا جو نہروں اور نالیوں سے سیراب ہوتا ہے، اس سے حاصل ہونے والی پیداوار میں کاشتکار کا صرف اتنا حصہ ہو گا جو خوشوں کی دلالی کے بعد خوشوں میں بچ رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا۔

ان تمام احادیث کو یکجا سامنے رکھنے سے جو واضح نتیجہ بر آمد ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ مزارعت کی یہ فاسد صورتیں جن میں زمین کا کوئی معین حصہ یا پیداوار کی کوئی طے شدہ مقدار زمیندار کے لئے طے کر لی جاتی تھی، اہل عرب میں ان کا عام رواج تھا، اور اس قدر رواج تھا کہ بقول حضرت رافع بن حدیج "کراء الارض" کا کوئی مطلب اس کے سوا سمجھا نہیں جاتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خاص صورتوں کو منع فرمایا، لیکن نہ تو نقد کرائے کے عوض زمین دینے کی ممانعت فرمائی، نہ وہ صورت اس ممانعت میں داخل ہے جس میں صرف پیداوار کا فی صد حصہ زمیندار نے اپنے لئے طے کیا ہو۔

حضرت رافعؓ کی مزید وضاحت:

نقد کرائے پر زمین دینے کا جواز تو حضرت رافع بن حدیجؓ کے الفاظ میں صراحتاً پیچھے گزر چکا ہے، جہاں تک فی صد حصے کی بٹائی کا تعلق ہے، اس کے بارے میں حضرت رافع بن حدیجؓ سے بعض احادیث ایسی منقول ہیں جن سے بظاہر اس کی بھی ممانعت معلوم ہوتی ہے. مثلاً ابو داؤد میں ان کا یہ ارشاد منقول ہے:

كنا نخابر على عهد رسول الله ﷺ فذكر أن بعض عمومة أتاه فقال : نهى

(۲) الفائق للزمخشری ص ۳۵۲ ج ۲۔

رسول الله ﷺ عن أمر كان لنا نافعا. و طواعية الله و رسوله أنفع لنا.
قال: قلنا: و ما ذالك قال: قال رسول الله ﷺ من كانت له أرض فليزرعها
أوليزرعها أخاه. ولا يكاريها بثلث ولا بربع. ولا طعام مسمى

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے مخابرہ (مزارعت) کیا کرتے تھے. پھر ہمارے کچھ چچا میرے پاس آئے اور انہوں نے کہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے کام سے ہمیں منع فرما دیا ہے جو (بظاہر) ہمارے لئے نفع بخش تھا. لیکن اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہمارے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔ ہم نے پوچھا، وہ کیا کام ہے؟ اس پر انہوں نے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس شخص کی کوئی زمین ہو، وہ اس میں خود کاشت کرے، یا دوسرے کو کاشت کے لئے دے دے، اور اسے ایک تہائی اور ایک چوتھائی کے معاوضے میں کرائے پر نہ اٹھائے، اور نہ کسی معین غلے کے معاوضے میں

اس روایت کے خط کشیدہ جملے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک تہائی یا ایک چوتھائی پیداوار کے معاوضے میں بھی زمین کو دینا (جسے بٹائی کہتے ہیں) آپؐ نے ممنوع قرار دیا۔ لیکن اول تو اس روایت کی تشریح ابن ماجہ اور مسند احمد کی ایک روایت سے معلوم ہوتی ہے، جس میں حضرت رافع بن خدیجؓ فرماتے ہیں:

كان أحدنا إذا استغنى عن أرضه أعطاها بالثلث و الربع و النصف. و اشترط ثلاث جداول و القصارة و ما سقى الربيع

ہم میں سے کسی کو جب اپنی زمین کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ تہائی چوتھائی اور آدھی پیداوار کے عوض کسی کو کاشت کے لئے دے دیتا تھا، اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا لیتا تھا کہ تین نالیوں کے قریب اگنے والی پیداوار. اور خوشوں میں بچا ہوا غلہ. اور چھوٹی نہر سے سیراب ہونے والی زمین کی پیداوار بھی اس کی ہوگی۔

اس روایت سے واضح ہے کہ جو لوگ پیداوار کا کوئی متناسب حصہ. مثلاً تہائی، چوتھائی وغیرہ اپنے لئے طے کرتے، وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے. بلکہ اس کے ساتھ مخصوص

---

(١) سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب المزارعة ـ والتشدید فی ذالک۔ حدیث نمبر ٣٣٩٥

(٢) سنن ابن ماجہ، باب ما یکرہ من المزارعة ص ١٧٩ ج ا و مسند احمد ص ٦٤ ج ٣۔

زمینوں کی پیداوار بھی اپنے لئے مقرر کر لیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مزارعت درست نہیں ہو سکتی. کیونکہ تہائی چوتھائی کی جو شرط جائز ہو سکتی تھی. اس میں مخصوص زمینوں کی پیداوار کا اضافہ کر کے اسے بھی خراب کر دیا گیا۔

لہٰذا جب ابن ماجہ کی اس روایت کی روشنی میں ابو داؤد کی مذکورہ بالا حدیث کو پڑھا جائے تو اس سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تہائی چوتھائی پیداوار کی شرط کو ناجائز قرار دینے کی وجہ یہ ہے ایسے معاملے میں عموماً متعین زمین یا متعین پیداوار کی۔ شرط بھی ساتھ ساتھ لگا دی جاتی تھی. اور اس کی وجہ سے یہ معاملہ ناجائز ہو جاتا تھا۔

یہ بات ہم شروع ہی میں لکھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک زیادہ پسندیدہ بات یہی تھی کہ انسان اپنی فاضل زمین دوسرے کو ہمدردی کے جذبے سے مفت مستعار دے دے. تاکہ وہ اس میں کاشت کر سکے. لہٰذا اس پسندیدہ طریقے کے مقابلے میں تہائی یا چوتھائی پیداوار کے معاوضے میں زمین دینا آپؐ کے نزدیک کوئی افضل یا پسندیدہ طریقہ نہیں تھا. اس لئے آپؐ نے بعض اوقات پہلے طریقے کی ترغیب دینے کے لئے دوسرے طریقے کے لئے ایسے الفاظ بھی استعمال فرمائے جن سے اس کی قدرے ناپسندیدگی کا تاثر ملتا ہے۔

مثلاً حضرت رافع بن خدیجؓ بھی فرماتے ہیں:

مر النبی ﷺ علی أرض رجل من الأنصار قد عرف أنه محتاج۔ فقال: لمن هذه الأرض؟ قال: لفلان أعطانيها بالأجر۔ فقال: لو منحها أخاه

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار میں سے ایک صاحب کی فصل کے پاس سے گزرے جن کے بارے میں آپؐ کو معلوم تھا کہ وہ ضرورت مند ہیں. آپؐ نے پوچھا: یہ زمین کس کی ہے؟ ان صاحب نے کہا کہ یہ فلاں شخص کی ہے. اس نے مجھے معاوضے پر دی ہے۔ آپ نے فرمایا:
کاش وہ یہ زمین اپنے بھائی کو بلامعاوضہ مستعار دیدیتا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاشتکار کو بلامعاوضہ زمین دینے کی جو ترغیب دی. اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ جائز معاوضے پر زمین دینا سرے سے ناجائز ہے. بلکہ مقصد یہ تھا کہ اسلامی اخوت و ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ ضرورت مند افراد کو فاضل زمین بلامعاوضہ دے دی جایا کرے۔ لیکن

---

(۱) سنن النسائی ص۱۵۱ ج۲. کتاب المزارعۃ. باب النہی عن کراء الارض بالثلث والربع. حدیث نمبر ۳۸۶۹۔

بعض حضرات نے آپؐ کے ان ارشادات سے یہ سمجھا کہ مزارعت بالکل ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رافع ابن خدیجؓ نے بھی آپؐ کے اس طرز عمل کی نشرو اشاعت اس شدت کے ساتھ فرمائی کہ اس سے لوگوں کو تاثر یہی ملا کہ حضرت رافعؓ صرف تہائی چوتھائی پیداوار پر زمین کی بٹائی کو ناجائز سمجھتے ہیں. لیکن دوسرے صحابہ کرامؓ نے اس خیال کی سختی کے ساتھ تردید فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ. فرماتے ہیں:

ان النبی ﷺ لم ینه عنه. ولکن قال: ان یمنح احدکم اخاه خیرله من ان یاخذ خرجا معلوما

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت سے منع نہیں کیا. بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اگر تم اپنی زمین اپنے بھائی کو عاریتہً دے دو تو یہ اس سے بہتر ہے کہ طے شدہ آمدنی اس سے وصول کرو

اور جب حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کا یہ طرز عمل حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بیان کیا گیا کہ وہ مزارعت سے منع کرتے ہیں, تو حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا:

قد علمنا انه کان صاحب مزرعة یکریها علی عهد رسول اللہ ﷺ علی ان له ما علی الربیع الساقی الذی یتفجر منه الماء وطائفة من التبن. لا ادری کم هی؟

ہمیں معلوم ہے کہ رافع ایک کھیت کے مالک تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسے اس شرط کے ساتھ کرائے پر دیا کرتے تھے کہ وہ چھوٹی نہر جس سے پانی پھوٹتا ہے. اس کے پاس پیداوار اور بھوسے کی ایک معین مقدار ان کی ہو گی. اور یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ پیداوار یا وہ مقدار کتنی ہو گی۔

اس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بھی وہی حقیقت بیان فرما دی کہ دراصل مزارعت کی ممانعت ان فاسد شرائط کے ساتھ مخصوص تھی. ورنہ صرف تہائی چوتھائی پر مزارعت ناجائز نہیں ہے. لیکن چونکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نہایت متقی اور محتاط بزرگ تھے۔ اور معمولی شبہات سے بھی پرہیز فرماتے تھے. لہٰذا مزارعت کی یہ حقیقت علمی طور پر واضح فرمانے کے باوجود انہوں نے

---

(۱) صحیح البخاری. کتاب الحرث والمزارعة. باب ذالم یشترط السنین فی المزارعة

(۲) سنن النسائی. کتاب المزارعة. باب النهی عن کراء الارض بالثلث والربع. حدیث نمبر ۳۹۰۸۔

احتیاطاً خود اپنا عمل تبدیل کر لیا۔ اور زمین کو مزارعت پر دینا ترک فرما دیا۔ تاکہ جس عمل میں ناپسندیدگی کا ادنیٰ سا شائبہ بھی ہو، اس سے بھی پرہیز ہو جائے۔

مزارعت کے جواز کے دلائل

اب میں ان دلائل کو مختصراً بیان کرتا ہوں جن سے پیداوار کے متناسب (فی صد) حصے کے عوض زمین کو بٹائی پر دینے کا جواز واضح طور پر ثابت ہوتا ہے:

(۱) اس سلسلے میں سب سے پہلی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمانے کے بعد مکہ مکرمہ سے مہاجرین کی ایک بڑی تعداد آ کر مدینہ طیبہ میں آباد ہوئی تو ان کے معاش اور روزگار کا مسئلہ پیدا ہوا۔ مدینہ طیبہ کے قدیم مسلمان باشندے جنہیں "انصار" کہا جاتا ہے، وہاں کی زمینوں کے مالک تھے۔ اور انہوں نے اپنے جذبہ ایثار سے کام لیتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مہاجرین کے لئے یہ پیش کش کی کہ ہم اپنی زمینیں اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ تقسیم کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تجویز کو قبول نہیں فرمایا۔ اور مہاجرین بھی اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس کے بعد انصار مدینہ نے دوسری متبادل تجویز یہ پیش کی کہ مہاجرین ہماری زمینوں پر کام کریں، اور پیداوار ہمارے اور ان کے درمیان مشترک طور پر تقسیم ہو۔ گویا بٹائی کا معاملہ کر لیا جائے۔ مہاجر صحابہ کرامؓ نے اس تجویز کو بخوشی قبول کر لیا۔ صحیح بخاریؒ میں یہ واقعہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

قالت الأنصار للنبي ﷺ : اقسم بيننا و بين اخواننا النخيل. قال : لا. فقالوا : تكفونا المؤونة ونشرككم في الثمرة قالوا : سمعنا و أطعنا.

> انصار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یا رسول اللہ، ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے درمیان نخلستان تقسیم فرما دیجئے، آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ اس پر انصار نے کہا، اچھا آپ لوگ (یعنی مہاجرین) ہمیں باغوں میں کام کرنے سے بے فکر کر دیں، (یعنی ہمارے بجائے آپ کام کریں) اور ہم آپ کو پھل میں شریک کر لیں گے۔ مہاجرین نے کہا، یہ ہمیں بخوشی منظور ہے۔

چنانچہ اس واقعے کے بعد سالہا سال مہاجر صحابہ کرامؓ اپنے انصاری بھائیوں کی زمینوں پر بحیثیت کاشتکار کام کرتے رہے، اور ان کے درمیان بٹائی کا معاملہ خوش اسلوبی سے چلتا رہا، یہ سب کچھ

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المزارعۃ، باب ۵ حدیث ۲۳۲۵، و کتاب الشروط، حدیث ۲۷۱۹۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر نگرانی اور آپ ؐ کی مکمل تائید و حمایت سے ہوا۔ اور آپ ؐ نے اس کی اجازت دی۔ بٹائی کا معاملہ بالکلیہ ناجائز ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین اور انصار کو اتنے بڑے پیمانے پر یہ معاملہ کرنے کی اجازت کیسے دے سکتے تھے؟

۲۔ خیبر کی زمینوں کا معاملہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بڑے پیمانے پر مزارعت کے معاملے کی دوسری اہم مثال خیبر کی زمینوں کی ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کا علاقہ فتح فرما لیا اور اس کی تمام زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آ گئیں تو ان کے پرانے مالک، جو تمام تر یہودی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور انہوں نے عرض کیا کہ خیبر کی زمینوں میں کاشت کرنے کا طریقہ ہمیں اچھی طرح آتا ہے، لہٰذا آپ ہمیں ان زمینوں پر بحیثیت کاشتکار کام کرنے دیں، پیداوار میں آدھا حصہ آپ کا اور آدھا ہمارا ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تجویز کو قبول فرما لیا اور ان کے ساتھ بٹائی کا معاملہ آدھی آدھی پیداوار طے ہو گیا۔ اور یہ معاملہ نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک، بلکہ آپ ؐ کے بعد حضرت عمرؓ کے زمانے تک جاری رہا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں یہودیوں نے کچھ ایسی شرارتیں کیں کہ حضرت عمر نے ان سے بٹائی کا معاملہ ختم کر کے انہیں تیما، اور اریحاء کی طرف جلاوطن کر دیا۔

خیبر کے اس واقعے کی تفصیل حدیث کی تقریباً تمام مستند کتابوں میں موجود ہے، محض مثال کے طور پر صحیح مسلمؒ سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے یہ مختصر الفاظ نقل کیے جاتے ہیں:

لما افتتحت خيبر سألت يهود رسول الله ﷺ أن يقرهم فيها على أن يعملوا على نصف ما خرج منها من الثمر والزرع، فقال رسول الله ﷺ أقركم فيها على ذلك ما شئنا

> جب خیبر فتح ہوا تو یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ان کو خیبر میں برقرار رکھا جائے، وہ زمینوں پر اس شرط کے ساتھ کام کرتے رہیں کہ زمینوں سے جو پھل یا کھیتی پیدا ہوگی اس کا آدھا حصہ وہ مسلمانوں کو دیا کریں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں اس وقت تک ان زمینوں پر برقرار رکھتا ہوں جب تک ہم چاہیں گے"

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ۔

اس واقعے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں سے صراحتاً بٹائی کا معاملہ فرمایا جو نہ صرف آپؐ کے وصال تک بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔ اگر بٹائی کا معاملہ بالکل ناجائز ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیبر کی زمینوں میں اس معاملے پر کیسے راضی ہو سکتے تھے؟

بعض حضرات نے خیبر کے اس معاملے کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ بٹائی کا معاملہ نہیں تھا، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو ان کی زمینوں پر برقرار رکھ کر پیداوار کا آدھا حصہ بطور خراج ان کے ذمے لگایا تھا جسے فقہی اصطلاح میں "خراج مقاسمہ" کہتے ہیں۔

لیکن خیبر کے واقعے کی تفصیلات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ تاویل بہت کمزور ثابت ہوتی ہے۔ دراصل اسلامی قانون کے تحت خراج کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں مفتوحہ ملک کی زمینیں مسلمانوں نے اپنی ملکیت میں لانے کے بجائے ان پر مفتوحہ ملک کے باشندوں کی ملکیت برقرار رکھی ہو، اس صورت میں ان کے ذمے خراج عائد کر دیا جاتا ہے جو بعض اوقات نقدی کی شکل میں ہوتا ہے جسے "خراج موظف" کہتے ہیں، اور بعض اوقات پیداوار کے کسی حصے کی شکل میں ہوتا ہے جسے "خراج مقاسمہ" کہا جاتا ہے۔

لیکن جہاں مفتوحہ ملک کی زمینیں مسلمان فاتحین کے درمیان تقسیم کر دی گئی ہوں، وہاں چونکہ زمینوں پر مکمل ملکیت مسلمانوں کو حاصل ہو جاتی ہے، اس لئے ان زمینوں پر خراج کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں مسلمانوں کی ملکیت ہونے کی حیثیت سے ان کی زرعی پیداوار پر عشر عائد ہوتا ہے۔ اسلامی قانون کا یہ اصول ایک مسلم اصول ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خیبر فتح ہونے کے بعد وہاں کی زمینوں پر یہودیوں کی ملکیت برقرار رکھی گئی تھی، یا وہ زمینیں مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دی گئی تھیں؟ اگر یہودیوں کی ملکیت برقرار رکھی گئی ہو، تب تو یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ پیداوار کا جو حصہ یہودیوں کے ذمے لگایا گیا تھا، وہ خراج کے طور پر تھا۔ لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ زمینیں مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دی گئی تھیں تو پھر اس کا خراج ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اس کا صاف مطلب یہی ہوگا کہ مسلمانوں نے اپنی مملوکہ زمینیں یہودیوں کو بٹائی پر دے دی تھیں، اس لئے پیداوار کا آدھا حصہ وہ مسلمانوں کو دیا کرتے تھے۔

خیبر کے واقعے اور وہاں کی زمینوں کے بندوبست کے بارے میں احادیث کے اندر پوری تفصیلات بیان ہوئی ہیں، ان کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ خیبر کی فتح کے

بعد وہاں کی زمینوں سے یہودیوں کی ملکیت بالکلیہ ختم ہو چکی تھی. اور وہ تمام زمینیں مسلمان فاتحین کو مالکانہ حقوق کے ساتھ دے دی گئی تھیں۔ یہ حقیقت یوں تو بہت سی روایات سے ثابت ہے. لیکن نمونے کے طور پر چند احادیث یہاں ذکر کی جاتی ہیں:

صحیح مسلم(۱) میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ (جو خود خیبر کی بعض زمینوں کے مالک تھے جو انہیں غزوۂ خیبر کے موقع پر ملی تھیں) فرماتے ہیں:

وكانت الأرض حين ظهر عليها لله ولرسوله و للمسلمين فأراد إخراج اليهود منها فسألت اليهود رسول الله ﷺ أن يقرهم بها على أن يكفوا عملها . ولهم نصف الثمر . فقال لهم رسول الله ﷺ نقركم بها على ذلك ما شئنا

(خیبر کی) زمین پر جب مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو وہ اللہ. اس کے رسولؐ اور مسلمانوں کی ہو گئی. چنانچہ آپؐ نے یہودیوں کو وہاں سے نکالنے کا ارادہ فرمایا۔ اس پر یہودیوں نے آپؐ سے درخواست کی کہ آپؐ انہیں اس شرط پر زمینوں پر برقرار رکھیں کہ وہ مسلمانوں کو زمینوں پر کام کرنے سے بے فکر کر دیں گے. اور اس کے عوض آدھا پھل ان کا ہو گا۔ تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم ان کو ان زمینوں پر اس وقت تک برقرار رکھتے ہیں جب تک ہم چاہیں"۔

اس حدیث میں صراحت ہے کہ زمین مسلمانوں کی ملکیت ہو چکی تھی. اسی لئے یہودیوں نے یہ الفاظ استعمال کئے کہ وہ مسلمانوں کو زمینوں پر کام کرنے سے بے فکر کر دیں گے. اور اس کے عوض آدھا پھل ان کا ہو گا اگر یہ معاملہ خراج کا ہوتا تو مسلمانوں کو کام سے بے فکر کرنے کے کوئی معنی نہیں تھے. کیونکہ خراجی زمینوں کے مالک خود اپنے لئے کام کرتے ہیں. کسی اور کے لئے نہیں۔

سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ خیبر کے معاہدے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

افتتح رسول الله ﷺ خيبر. و اشترط أن له الأرض و كل صفراء و

---

(۱) صحیح مسلم. کتاب المساقاة. قبیل باب فضل الغرس والزرع۔

بیضاء. وقال أهل خيبر: نحن أعلم بالأرض منكم فأعطناها على أن لكم نصف الثمرة. ولنا نصف. فزعم أنه أعطاهم على ذلك.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر فتح فرمایا، اور یہ طے فرمایا کہ زمین اور سونے چاندی آپؐ کی ملکیت ہو گی۔ اہل خیبر نے کہا کہ ہم اس زمین کو آپ سے زیادہ جانتے ہیں، اس لئے ہمیں یہ زمین اس معاہدے پر دیدیجئے کہ آدھا پھل آپکا ہو گا، اور آدھا ہمارا حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ نے زمینیں ان کو اس معاہدے پر دیدیں۔

اس کے علاوہ امام ابو داوُدؒ نے حضرت بشیر بن یسار کی ایک مفصل روایت نقل کی ہے جس میں انہوں نے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کی چھتیس حصے کر کے انہیں کس طرح مسلمانوں کے درمیان تقسیم فرمایا۔ تقسیم کی یہ تفصیل بیان کرنے کے بعد وہ فرماتے ہیں:

«فلما صارت الأموال بيد النبي ﷺ و المسلمين لم يكن لهم عمال يكفونهم عملها. فدعا رسول الله ﷺ اليهود. فعاملهم»

جب تمام جائیدادیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے قبضے میں آ گئیں تو اب مسلمانوں کے پاس ایسے کارندے نہیں تھے جو انہیں زمینوں پر کام کرنے سے بے فکر کر سکیں، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو بلایا، اور ان سے (مزارعت کا) معاملہ فرمایا۔

ان احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معاملے کی پوری تفصیل بیان کر دی گئی ہے جو آپؐ نے یہودیوں کے ساتھ فرمایا۔ اسے دیکھنے کے بعد اس معاملہ میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ خیبر کی زمینوں کے مالک مسلمان تھے، اور یہودیوں کو ان زمینوں پر کاشتکار کی حیثیت میں باقی رکھا گیا تھا، اور ان سے آدھی پیداوار پر بٹائی کا معاملہ کیا گیا تھا۔ اور یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک، بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہا۔

اہل مدینہ کا عام تعامل

یہ دو مثالیں تو خاص طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے عمل سے متعلق تھیں، ان

(۱) سنن ابی داوٗد کتاب البیوع، باب المساقاۃ ص ۴۸۳ ج ۱

(۱) سنن ابی داوٗد، کتاب الخراج والفیئ، باب ماجاء فی حکم ارض خیبر ص ۴۲۴ ج ۱۔

کے علاوہ مدینہ منورہ میں عہد رسالت ؐ اور عہد صحابہؓ میں زمینوں کو بٹائی پر دینے کا عام رواج تھا. امام بخاریؒ امام ابو جعفر محمد الباقرؒ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ:

«ما بالمدینۃ أھل بیت ھجرۃ إلا یزرعون علی الثلث و الربع»

مدینہ طیبہ میں مہاجرین کا کوئی گھرانہ ایسا نہیں ہے جو تہائی اور چوتھائی پیداوار پر کاشت نہ کرتا ہو۔

اس کے بعد امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ، حضرت سعد بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ عمر بن عبدالعزیزؒ، قاسم بن محمدؒ، عروہ بن الزبیرؒ، حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کی اولاد اور محمد بن سیرینؒ سب مزارعت پر عمل کرتے تھے۔ (۲)

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات پوری قوت کے ساتھ ثابت ہو جاتی ہے کہ پیداوار کا فی صد حصہ طے کر کے بٹائی کا معاملہ شریعت میں جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ کے بارے میں بیشک یہ مشہور ہے کہ وہ مزارعت کو ناجائز کہتے تھے. لیکن اس کی حقیقت بھی فقہ حنفی کی مشہور کتاب "حاوی القدسی" میں یوں بیان کی گئی ہے کہ:

«کرھھا أبو حنیفۃ، ولم ینہ منھا أشد النھی»

امام ابو حنیفہؒ نے مزارعت کو ناپسند کیا ہے. لیکن اس سے شدت کے ساتھ منع نہیں کیا

یہی وجہ ہے کہ مزارعت کے معاملے کی جزوی تفصیلات میں امام ابو حنیفہؒ نے بہت سے مسائل بیان فرمائے ہیں۔ اگر مزارعت کا معاملہ ان کے نزدیک بالکل ناجائز ہوتا تو ان مسائل کو بیان کرنے کے کوئی معنی نہیں تھے۔

ہمارے زمانے کی مزارعت کے مفاسد اور ان کا انسداد

مزارعت کے جواز پر مآخذ شریعت سے دلائل کا خلاصہ پیچھے عرض کر دیا گیا ہے۔ اس مسئلے کی مزید تفصیلات اور متعلقہ احادیث پر فنی گفتگو احقر نے صحیح مسلمؒ پر اپنی شرح "تکملہ" فتح الملہم کی پہلی جلد میں کی ہے. جو اہل علم مزید تفصیلات کے خواہش مند ہوں. وہ اس کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں (۲) لیکن اس کتاب کی حد تک مذکورہ بالا بحث انشاء اللہ طالبین حق کے لئے کافی ہو گی۔

آخر میں ایک سوال کا جواب دینا مناسب ہو گا۔ آج کل جو حضرات مزارعت کو ناجائز قرار دینے

---

(۲) صحیح البخاری. کتاب الحرث والمزارعۃ. باب المزارعۃ بالشطر ونحوہ۔

پر اصرار فرماتے ہیں. ان کا ایک بنیادی استدلال یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں زمینداری اور جاگیر داری کا جو نظام صدیوں سے رائج ہے. اس میں یہ بات بڑھتا نظر آتی ہے کہ زمینداروں نے اپنے کاشتکاروں پر ناقابل بیان ظلم توڑے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اس ظلم و ستم کا اصل سبب مزارعت کا یہ نظام ہے۔ اگر اسے ختم کر دیا جائے تو کاشتکاروں کو اس ظلم سے نجات مل جائے گی۔

اس سلسلے میں ہم دو نکات کی طرف قارئین کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں:

(۱) بلاشبہ ماضی قریب میں زمینداروں کی طرف سے کاشتکاروں کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ناانصافی کے بہت سے روح فرسا واقعات رونما ہوئے ہیں. لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ان افسوسناک واقعات کا سبب "مزارعت" کا معاملہ ہے؟ اگر ان افسوسناک واقعات کا حقیقت پسندی سے جائزہ لیا جائے تو واضح طور پر یہ بات نظر آئے گی کہ ان واقعات کا اصل سبب "مزارعت" کا معاملہ نہیں. بلکہ وہ ناجائز اور فاسد شرطیں ہیں جو زمینداروں نے قولی یا عملی طور سے کاشتکاروں پر عائد کر رکھی تھیں. ان فاسد اور ناجائز شرطوں میں کاشتکاروں سے بیگار لینا. اس پر ناواجبی ادائیگیوں کا بوجھ ڈالنا. اس کی محنت کا منصفانہ معاوضہ نہ دینا. انہیں اپنا غلام یا رعایا سمجھنا. یہ ساری باتیں داخل ہیں۔ حالانکہ شریعت نے جس "مزارعت" کی اجازت دی ہے. وہ دوسرے معاشی معاملات کی طرح ایک معاملہ ہے جس کے دونوں فریق بالکل برابر کی حیثیت رکھتے ہیں. ان میں سے کسی بھی فریق کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو کمتر سمجھے. یا اس پر معاملے کی جائز شرائط کے علاوہ کوئی اضافی شرط عائد کرے. اس سے بیگار لے. یا اس کے ساتھ غلاموں کا سا برتاؤں کرے۔ ان تمام باتوں کا اسلام اور اس کی شریعت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اسلامی احکام کی رو سے جس طرح ایک شخص اپنا مال دوسرے کو دے کر اس سے مضاربت کا معاملہ کرتا ہے (جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اس مال سے کاروبار کرے. اور جو نفع حاصل کرے وہ دونوں کے درمیان تقسیم ہو جائے) تو اس سے مال دینے والے اور کام کرنے والے کے درمیان ایک معاشی رشتہ قائم ہوتا ہے جس میں دونوں کی حیثیت برابر کے فریقوں کی ہے. ان میں سے کوئی فریق دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں رکھتا. اسی طرح مزارعت میں بھی مالک زمین اور کاشتکار برابر کے دو فریق ہیں. اور کاشتکار کو کمتر سمجھنا. یا اس پر ناواجبی شرائط عائد کرنا اسلامی احکام کے قطعی خلاف ہے۔

اگر ان ناواجب شرائط کو خلاف قانون. بلکہ تعزیری جرم قرار دے کر اس پر موثر عملدر آمد کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ خرابیاں باقی رہیں۔

اس کے علاوہ مزارعت کے معاملے کو ایک منصفانہ معاملہ بنانے کے لئے جس میں کاشت کار کو اپنی محنت کا پورا صلہ مل سکے، حکومت کی طرف سے بہت سے اقدام کئے جا سکتے ہیں جن کے بارے میں معین تجاویز ہم نے آگے "زرعی اصلاحات" کے مقدمے میں اپنے فیصلے کے پیراگراف نمبر ۱۵۰ میں بیان کی ہیں۔

اور اگر بالفرض ان اقدامات کے باوجود کوئی اسلامی حکومت یہ محسوس کرے کہ زمینداروں کی بدعنوانیوں پر قابو پانا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کچھ عرصے کے لئے مزارعت پر پابندی عائد نہ کر دی جائے۔ تو اس کے لئے یہ دعویٰ کرنے کی ضرورت نہیں کہ مزارعت اسلام میں ناجائز ہے، کیونکہ اسلام میں مزارعت جائز ضرور ہے لیکن اسے واجب کسی نے نہیں کہا، بلکہ جیسے پیچھے عرض کیا جا چکا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی مثالی طریقہ بھی قرار نہیں دیا۔ لہذا اگر کوئی صحیح معنی میں اسلامی حکومت ان بدعنوانیوں کے انسداد کے لئے وقتی طور پر "مزارعت" کے طریقے پر پابندی عائد کر دے تو شریعت میں اس کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن یہ پابندی اس اشتراکی پروپیگنڈے کے زیر اثر اس بنیاد پر نہیں ہونی چاہئے کہ زمین کی شخصی ملکیت درست نہیں ہے، یا مزارعت بذات خود کوئی ناجائز معاملہ ہے، بلکہ یہ سد ذرائع کے طور پر بدعنوانیوں کے خاتمے کے لئے ہونی چاہئے جو ایک عارضی اور وقتی تدبیر ہوگی، کوئی دائمی حکم نہ ہوگا۔ لیکن زمینداروں کی بدعنوانیوں کو بنیاد بنا کر شخصی ملکیت کے ادارے ہی کو ختم کرنا، یا مزارعت کے معاملے کو اصولی طور پر ہی ناجائز قرار دینا قرآن و سنت کے دلائل کی روشنی میں کسی طرح جائز نہیں۔

واللہ سبحانہ اعلم